اردو زبان کا سیاسی معاشرتی اور اقتصادی معاملات پر آزادی سے بحث کرنیوالا رسالہ

# ساربان لاہور

جلد ۳ | فہرست مضامین رسالہ ساربان بابت ماہ مئی ۱۹۳۷ء | نمبر ۵


| نمبر شمار | مضمون | مضمون نگار | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | تعلیم کے بغیر قومی ترقی محال ہے | غلام محمد خان بی۔ اے۔ | ۲ |
| ۲ | جغرافیائی حالات کا اثر ہندوستان کی تاریخ و تمدن پر | پروفیسر نند کمار ایم۔ اے | ۴ |
| ۳ | صوبجاتی اسمبلیاں اور ہماری مادری زبانیں | سید محمود مورخ بی۔ اے۔ | ۷ |
| ۴ | جاگ ہندوستان | عبدالرحیم صاحب شبلی بی۔ کام | ۹ |
| ۵ | سودائے وطن (نظم) | جناب فیض محمد صاحب فیض لدھیانوی | ۱۰ |
| ۶ | مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درباری | مسٹر ہندر لال بی۔ اے۔ | ۱۱ |
| ۷ | جاپان کا سیاسی مذہب | غلام محمد خان بی۔ اے۔ | ۱۴ |
| ۸ | پانی پت کی آخری جنگ | پنڈت کاشی رائے وقائع نویس | ۱۶ |
| ۹ | انسان کیونکر تندرست رہ سکتا ہے؟ | حکیم شاہ محمد خاں زبدۃ الحکماء | ۲۲ |
| ۱۰ | یہ عالم ہے بیداری کا (نظم) | سید مظفر حسین صاحب فہیم | ۲۴ |
| ۱۱ | علمبردار حریت مصطفےٰ کمال | مولانا عبدالسبحان صاحب اعظمی | ۲۵ |
| ۱۲ | نانی چندو (مذاحیہ) | مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی بی اے ہوم سکرٹری حیدرآباد دکن | ۲۹ |
| ۱۳ | دلچسپ معلومات | ایڈیٹر | ۳۳ |
| ۱۴ | نوحہ ستانہ (نظم) | منشی سکھدیو پرشاد بسمل الہ آبادی | ۳۶ |
| ۱۵ | جذبہ خودداری | شیخ نذیر احمد ایم۔ ایس سی۔ ایل ایل۔ بی پلیڈر | ۳۷ |
| ۱۶ | اقتباسات | ایڈیٹر | ۴۰ |
| ۱۷ | شذرات | ایڈیٹر | [illegible] |


[illegible]

# تعلیم کے بغیر قومی ترقی محال ہے

تعلیم ہندوستان کا بہت اہم مسئلہ ہے۔ تعلیم کے بغیر عوام شہریت کے فرائض عمدگی سے سرانجام نہیں دے سکتے۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں شدید بیکاری کے ہوتے ہوئے تعلیمی ترقی کا تذکرہ عجیب سا معلوم ہوتا ہو لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ تعلیم ایک ضروری شے ہے اور ہر شخص کا پیدائشی حق ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرے۔ اور کوئی حکومت اپنے فرائض کی ادائیگی میں کامیاب نہیں کہلا سکتی جب تک وہ رعایا کی تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست نہ کرے۔ عالم انسانیت کی نجات تعلیم میں مضمر ہے اور ہندوستان کے مختلف مسائل بھی عوام کی تعلیم کے بغیر حل نہیں ہوسکتے۔

## ہمارا تعلیمی نظام

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں ایک نظام تعلیم موجود ہے لیکن بیحد گراں ہونے کی وجہ سے اس کا حلقۂ فائدہ رسانی محدود ہے۔ اس کے علاوہ اس کے طریق کار اور نصب العین میں ہندوستان کی ضروریات کو مدنظر نہیں رکھا گیا یہی وجہ ہے کہ یہاں کے تعلیم یافتہ ہندوستان میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو اجنبی سمجھتے ہیں۔ اور اپنے غیر تعلیم یافتہ بھائیوں سے اجنبیوں کی طرح ہی پیش آتے ہیں۔ موجودہ نظام کی رو سے تعلیم کو عوام تک پہنچانے میں تو مکمل طور پر ناکامی ہوئی ہے۔

حکومت انگریزی کو ہندوستان میں قائم ہوئے ڈیڑھ صدی ہوگئی ہے۔ اس عرصہ دراز میں تعلیم کے لحاظ سے ہندوستان ابھی ابتدائی منزل میں ہی نظر آتا ہے۔ عوام کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا حکومت کا فرض ہے۔ اور حکومت بھی اپنے اس فرض کے احساس کا بڑے زور شور سے دعوے کرتی ہے باوجود اس کے اس مقصد میں کامیابی کیوں نہیں ہوتی؟ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے جہاں بیشمار زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ کوئی ایسی رکاوٹ نہیں جس پر عبور حاصل کرنا محال ہو۔ روس بھی ہندوستان کی طرح وسیع ملک ہے اور وہاں بھی سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہاں کے لوگ بھی لکیر کے فقیر تقدیر کے دلدادہ اور ترقی سے نفرت کرنے والے تھے لیکن وہاں کی حکومت کی کوششوں سے پندرہ سال کے قلیل عرصہ میں تمام روسی لکھنے پڑھنے لگ گئے ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں انگریزوں کو حکومت کرتے ڈیڑھ سو سال ہوگئے لیکن بمشکل سات فی صدی لوگ تعلیم یافتہ نظر آئیں گے۔

ہندوستان کی تعلیمی پستی کی بڑی وجہ حکومت کی تغافل شعاری ہے اس کے علاوہ نظام تعلیم کو بھی بہت حد تک دخل ہے۔ مثلاً ہندوستان میں مدرسے اس غرض سے قائم کئے گئے تھے کہ حکومت کو مختلف محکموں کا کام چلانے کے لئے ماتحت ملازم مل سکیں۔ اب تک تعلیم کا یہی مقصد سامنے ہے یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی تعلیم یافتہ سوائے ملازمت کے اور کوئی کام نہیں کرسکتے۔

قومی شائستگی اور تہذیب کا دارومدار زیادہ تر ثانوی یعنی ہائی سکولوں کی تعلیم پر ہے۔ لیکن یہاں سے جو نوجوان نکلتے ہیں ان میں سے بمشکل ایک فیصدی کو سرکاری ملازمت مل سکتی ہے یہ نوجوان کوئی اور ہنر تو جانتے نہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے

کہ یہ بیکار رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی بجائے خود سوسائٹی پر ایک بوجھ بن کر رہ جاتے ہیں۔ بقول مسٹر عبداللہ یوسف علی :-

"ہندوستان میں ثانوی تعلیم کے دوران میں نوجوانوں کو کسی قسم کی کارآمد تعلیم دینے کی بجائے ان کو ذہنی کرتبوں کی مشق کرائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ روزمرہ کی زندگی کے کسی کام کی اہلیت پیدا نہیں کر سکتے ہمارے نوجوانوں کا وقت محنت اور قوم کا روپیہ بغیر کوئی نتیجہ پیدا کئے ضائع ہو جاتا ہے"۔

ہندوستان میں موجودہ طریق تعلیم انگلستان کے طرز پر جاری ہے۔ انگریزوں کی عملداری قائم ہونے سے ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کے لئے وہی طریق اختیار کیا گیا جو انگلستان میں رائج تھا لیکن اس کو اب سو سال سے بھی زائد ہو گیا ہے۔ اس دوران میں انگلستان نے تو اپنے طریق تعلیم میں نمایاں تبدیلیاں کر لی ہیں لیکن ہندوستان میں وہی طریق تعلیم جاری ہے جو آج سے ایک صدی قبل جاری کیا گیا تھا حالانکہ یہ طریق اس وقت بھی ہندوستان کے حالات کے مطابق نہ تھا۔

ہر ملک میں مختلف حالات کے ہوتے ہوئے طریق تعلیم بھی مختلف ہونا چاہیئے اس لحاظ سے ہندوستان میں وہ طریق رائج نہیں کرنا چاہیئے تھا جو انگلستان میں جاری تھا۔ ہندوستان کے حالات کے ناموافق طریق تعلیم کا نتیجہ ہے کہ یہاں وقت اور محنت کے لحاظ سے تعلیمی لیاقت اور استعداد پیدا نہیں ہوتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کے نظام تعلیم اور طریق تعلیم دونوں کی نئے سرے سے اور نئے اصولوں کے مطابق تنظیم کی جائے۔ اور ایسا کرتے ہوئے ہندوستان کے باشندوں کے حالات اور ضروریات کو خاص طور پر مدنظر رکھا جائے۔

مذکورہ بالا غرض کے لیئے کوئی بنا بنایا اور ترشا ترشایا طریق تعلیم اختیار نہیں کر سکتے۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان کے اندر چھوٹے چھوٹے پیمانہ پر کثیر تعداد ایسے مدارس کھولے جائیں جہاں مختلف طریق ہائے تعلیم کا تجربہ کیا جائے۔ اور ایک عرصہ کے بعد جو طریق سب سے افضل ثابت ہو اسے تمام ملک میں رائج کر دیا جائے۔ اس طرح کرنے سے روپیہ بھی کم خرچ ہوگا اور بہترین طریق تعلیم بھی دستیاب ہو جائے گا۔ ایسا کئے بغیر کسی اور ملک کے طریق تعلیم کو تمام ہندوستان کے مدارس میں رائج کر دینا خلاف عقل اور روپیہ وقت اور محنت کا ضائع کرنا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان کے مقابلہ میں جرمنی، فرانس، انگلستان بہت چھوٹے چھوٹے ملک ہیں لیکن ان سب میں مختلف قسم کے تعلیمی طریقے رائج ہیں۔

بدقسمتی سے سلطنت برطانیہ میں ہندوستان ہی ایک ملک ہے جہاں کے عوام غیر تعلیم یافتہ ہیں اور ان کو بدقت ایک وقت کا کھانا میسر ہوتا ہے یا جن میں بیماریوں اور وباؤں کی کثرت ہے۔ ہندوستان کے متوسط طبقہ کی حالت بھی چنداں قابل رشک نہیں۔ اگرچہ وہ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں لیکن ان کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہے۔ ان کو زمانہ تعلیم میں یہ نہیں سکھایا گیا کہ ان کے ملک کو کن کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ اس طبقہ کے لوگوں کا اکثر وقت غیر ملکیوں کی عادات و اطوار کی نقل کرنے میں گزرتا ہے۔ ان کی تعلیم ان کو اس قابل نہیں بناتی کہ وہ کوئی ہنر سیکھ کر اپنے لیئے کوئی مشغلہ زندگی مہیا کر سکیں۔

ملکی جرائد قوم کی زندگی کو بناتے ہیں لیکن یہاں قانون کی سختیوں کی وجہ سے اخبارات اور رسائل قوم کی رہنمائی کا کام سرانجام نہیں دے سکتے۔ غرضکہ ہندوستان کا نظام تعلیم ایک بیجان چیز ہے جو ہندوستانیوں کو کسی مقررہ منزل کی طرف لے جانے سے قاصر ہے۔

# جغرافیائی حالات کا اثر ہندوستان کی تاریخ و تمدن پر

انسان ذی عقل اور صاحب ارادہ ہستی ہے اسی بنا پر اس کی زندگی ارد گرد کی چیزوں کو مغلوب کرنے میں صرف ہوتی ہے باوجود اس کے بغور دیکھا جائے تو ہر قوم کی تاریخ و تمدن ملک کے جغرافیائی حالات کے تابع نظر آئیں گے

تاریخ سے مراد صرف بادشاہوں کی تخت نشینی اور جنگوں کے حالات ہی نہیں بلکہ اس میں ملک کے باشندوں کی تہذیب و تمدن کو بھی شامل کرنا ضروری ہے۔

ہندوستان کے شمال میں دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ہمالیہ ہے جو اس جانب سے دشمنوں کو ملک کے اندر داخل ہونے نہیں دیتا۔ لیکن شمال مغرب کی طرف قدرتی درے ہیں جن میں سے ہمیشہ سے حملہ آور آتے رہے ہیں۔

جس ملک میں بارش نہ ہوتی ہو یا مقررہ اوقات پر نہ ہوتی ہو وہاں کے باشندوں کو اکثر قحط کا سامنا رہتا ہے اسی طرح جہاں بکثرت بارشیں ہوں طوفان کا خطرہ رہتا ہے جس سے سینکڑوں ہزاروں گھر مسمار اور فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

پہاڑوں دریاؤں اور زمین کی سطح کے علاوہ درجہ حرارت ہوائیں' بارش' سمندری لہریں' نباتات' حیوانات' جمادات وغیرہ سبھی چیزیں ملکی جغرافیہ سے متعلق ہیں اور کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ان چیزوں کا اثر لوگوں کی عادات و اطوار پر بہت پڑتا ہے۔

ہندوستان کے شمال اور شمال مغرب میں ایک نہایت طویل اور عریض میدان ہے جس میں کوہ ہمالیہ سے نکل کر بہت سے دریا بہتے ہیں اس لیے یہ علاقے بیحد زرخیز ہیں۔ جنوبی ہندوستان سطح مرتفع ہے جہاں کی زمین سخت اور پانی کی قلت ہے۔ کوہ بندھیاچل شمالی و جنوبی ہندوستان کو علیحدہ کرتا ہے۔ شمالی ہندوستان میں راجپوتانہ کا بہت بڑا خشک اور ریتلا صحرا بھی ہے۔ اب بغور دیکھا جائے تو ان جغرافیائی حالات نے ہندوستان کی تاریخ کو بنانے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ اس امر کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ وسعت کے لحاظ سے ہندوستان میں ہر قسم کے جنگلات' حیوانات اور ہر قسم کی آب و ہوا پائی جاتی ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بحر منجمد شمالی کا نظارہ پایا جاتا ہے جہاں ہر وقت برف جمی رہتی ہے اور سندھ اور راجپوتانے کے ریگستانوں میں گرم سے گرم مقامات بھی پائے جائیں گے۔ یہی نہیں دنیا میں سب سے زیادہ بارش والے علاقے بھی ہندوستان میں پائے جاتے ہیں گویا کہ ہندوستان ملک نہیں بلکہ چھوٹے پیمانہ پر تمام دنیا کا نمونہ ہے۔

آج سے تقریباً چار ہزار سال قبل شمال مغربی دروں کی راہ سے آریہ قوم پنجاب میں داخل ہوئی۔ اور یہاں کے اصلی باشندوں یعنی کول اور دراوڑ قوموں کو جنوب کی طرف دھکیل کر خود دریائے گنگا اور سندھ کی وادیوں میں آباد ہو گئے۔ اور ایک بالکل نئی تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالی۔

آج سے سوا دو ہزار سال قبل سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا اس کے بعد اس کے جانشین شمالی ہندوستان پر حکومت کرنے لگے لیکن ان کی قوت آپس کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔

سکندر اعظم کے بعد مسلمانوں کے حملے قابل ذکر ہیں۔ سب سے

پہلے آج سے بارہ سو سال قبل ایک عربی سردار محمد بن قاسم نے سمندر کے راستہ حملہ کر کے سندھ پر قبضہ جما لیا۔ سندھ پر عربوں کا قبضہ تقریباً ایک صدی تک رہا۔ مسلمانوں کا دوسرا حملہ شمال مغربی پہاڑی دروں کے راستہ ہوا جبکہ محمود غزنوی نے گیارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان پر پے در پے سترہ حملے کئے جس کی وجہ سے پنجاب اس کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ گیارھویں صدی کے آخر میں شہاب الدین غوری نے ہندوستان پر متعدد حملے کئے جس کی وجہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت مستقل طور پر قائم ہو گئی۔

مسلمانوں کی حکومت کے دوران میں یورپین لوگوں نے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرنے کی کوشش کی چنانچہ ۱۴۹۸ء میں پرتگیزی ملاح واسکوڈےگاما کالی کٹ کے ساحل پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ پرتگیزوں کے نقش قدم پر ولندیزی، فرانسیسی اور انگریز بھی بحری راستہ سے ہندوستان کے ساتھ تجارتی کاروبار کرنے لگے۔

ہندوستان اس قدر وسیع ملک ہے اور بڑے بڑے دریاؤں اور پہاڑوں سے اس قدر چھوٹے چھوٹے جغرافیائی خطوں میں تقسیم ہے کہ سب کو ایک سلطنت کے ماتحت لانا معمولی کام نہیں تھا۔ ۱۷۰۷ء میں شہنشاہ اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوتے ہی ہندوستان چھوٹی چھوٹی خود مختار سلطنتوں میں منقسم ہو گیا۔ اگر تمام ہندوستان کی ایک مرکزی حکومت قائم ہوتی تو انگریزوں کے لیئے ہندوستان کی حکومت حاصل کر لینا تقریباً ناممکن تھا۔

قدیم زمانہ میں ہندوستان کے مختلف شہروں کی آبادی اور خوشحالی بھی جغرافیائی حالات پر منحصر ہوتی مثلاً دہلی شمال مغرب کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں کے راستہ پر واقع ہے اس لیئے کئی مرتبہ آباد ہوا اور کئی مرتبہ اجاڑا گیا۔

جغرافیائی حالات میں آب و ہوا سب سے طاقتور عنصر ہے مختلف آب و ہوا میں مختلف اناج پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ آب و ہوا کا اثر انسان کی صحت و تندرستی پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ان اثرات کی تفصیل یہ ہے کہ ہندوستان بارش ہونے والی مون سون ہواؤں کے خطہ میں واقع ہے چونکہ شمالی ہندوستان کی زمین نرم اور زرخیز ہے اور بارش بھی حسب ضرورت ہو جاتی ہے یہاں تھوڑی محنت سے کاشت کاری ہو سکتی ہے۔ مون سون ہواؤں کے علاوہ شمالی ہندوستان میں بکثرت دریا ہیں ان دونوں باتوں نے مل کر شمالی ہندوستان میں مختلف قسم کے اناجوں کی پیداوار کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ علاقہ بہت گنجان آباد ہے۔ اور دنیا کے ان خطوں میں سے ہے جہاں تہذیب و تمدن نے جنم لیا۔

ہندوستان گرم ملک ہے اس لیئے یہاں جنگلوں اور صحراؤں میں گشت کرنا مذہبی رنگ اختیار کر گیا اور رفتہ رفتہ سنیاسیوں کا گروہ پیدا ہو گیا۔ بحر منجمد شمالی کے قریب کے ملکوں میں اس قسم کی ذہنیت ہرگز نشوونما نہیں پا سکتی۔

چونکہ ہندوستان میں کھانے پینے کی چیزیں آسانی سے مہیا ہو سکتی ہیں اس لیئے ضرورت محسوس ہوئی کہ زندگی کی دوسری ضروریات کی بہم رسانی کے لیئے مختلف لوگوں کو مقرر کیا جائے۔ اس غرض کے لیئے جو طبقات یا جماعتیں بنائی گئی تھیں انہوں نے ہی بعد میں ذات پات کی شکل اختیار کر لی اور جو اب تک موجود ہیں۔

ہندوستان میں دریاؤں سے زمین کی زرخیزی وابستہ ہے اس لیئے دریاؤں کو عظمت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح چونکہ گرمی زیادہ ہوتی ہے اس لیئے پیپل اور بڑ جیسے سایہ دار درخت بھی متبرک مانے گئے۔ قدیم زمانہ کے

ہندوستانی دودھ کے فوائد سے آگاہ تھے اس لئے گائے
کی عظمت ان کے دلوں میں جاگزیں ہوگئی بالخصوص اس لیے
بھی کہ گائے نہ ہو تو کھیتوں میں ہل چلانے کے بیل بھی میسر
نہیں آسکتے۔

انسان اپنی عقل اور محنت سے بنجر زمین کو زرخیز بنا سکتا
ہے۔ دریاؤں کے رُخ بدل سکتا اور پہاڑوں میں سرنگ بنا سکتا
ہے۔ لیکن آب وہوا کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ نپولین نے یورپ
کی طاقتور ترین فوجوں کو کچل ڈالا لیکن روس کی سردی کا مقابلہ
نہ کر سکا اور یہیں سے اس کا تنزل شروع ہوتا ہے۔ سکندر
اعظم یلغار کرتا ہوا یورپ سے ہندوستان آن پہنچا۔ لیکن
پنجاب کی گرمی نے ایسا گھائل کیا کہ اس کی فوجوں نے
آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

ہندوستان کی گرم آب وہوا سے روح اور جسم دونو
تحلیل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرد علاقوں سے آنے والے
ہر نئے حملہ آور نے ہندوستانی فوجوں کو زیر کرنے میں کامیابی
حاصل کی۔ انگریزی حکومت کی قوت کا راز بھی اسی امر میں مضمر
ہے کہ گورہ فوجیں انگلستان کی سرد آب وہوا کے پروردہ
ہوتی ہیں۔

ہندوستان کے پہاڑوں میں سنگ مرمر کے علاوہ سیکڑوں
رنگ کے قیمتی پتھر بکثرت ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بےشمار
تعداد میں پتھر سے مندر، خانقاہیں اور مسجدیں بنائی گئیں جن پر
حیرت انگیز دستکاری کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ تاج محل آگرہ
جیسی عمارت جس کی مثال چشم فلک نے نہ دیکھی تھی ہندوستان
کے سوا کسی ایسے ملک میں نہ بن سکتی تھی جہاں سنگ مرمر
پیدا نہ ہوتا ہو۔

خدا نے ہندوستان کو زرخیز زمین آسمان سے باتیں
کرنے والے پہاڑ، صاف شفاف پانی والے دریا اور ہر قسم کی معدنیات
بکثرت عطا کی ہیں جن کی وجہ سے ہندوستان دنیا کا دولتمند
ترین ملک بن گیا تھا۔ قدرت کی اسی فیاضی کا نتیجہ ہے کہ
دوسری اقوام اس کو ہمیشہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہیں
اور ہر ایک کی یہ خواہش رہی کہ اس سونے کی چڑیا کو اپنے
قبضہ میں کرلے اور یہی امر ہندوستان کی تاریخ کا
بنیادی پتھر ہے۔

پروفیسر انندکمار ایم۔ اے

## ضروری التماس

رسالہ "ساربان" تفریح طبع یا دل بہلاوے کے لیئے جاری نہیں کیا گیا۔
بلکہ ہندوستانیوں میں بلند خیالی اور اتحاد و اتفاق کا جذبہ پیدا کرکے
انہیں ترقی کی طرف لے جانا اس کا واحد مقصد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشاہیر قوم اور ملک کے مقتدر جرائد نے
"ساربان" کو ایک بیحد مفید کارآمد اور اردو رسائل کی دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز قرار دیا ہے اس کا مقصد تجارتی
نہیں اس لیئے اس میں عشقیہ غزلیں، بیہودہ افسانے اور حیا سوز تصاویر نہیں شائع کی جاتیں پس سکولوں اور
لائبریریوں کا اخلاقی فرض ہے کہ رسالہ "ساربان" کو جاری کرالیں تاکہ زیادہ لوگ اس کے بلند پایہ
اور زندگی بخش مضامین سے فائدہ اٹھا سکیں۔ سالانہ چندہ صرف **تین روپیہ** ہے۔

**مینیجر**

# صوبجاتی اسمبلیاں اور ہماری مادری زبانیں

دنیا کے ہر متمدن اور آزاد ملک کی اپنی اپنی قومی زبان ہے۔ اور ایک محکوم اور غلام قوم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی کوئی قومی زبان نہیں ہوا کرتی ہے۔ ہندوستان چونکہ ہزارہا سال سے ایک غلام و محکوم ملک رہا ہے اس لئے جب آریاؤں نے یہاں ڈیرا جمایا تو سنسکرت ملکی زبان قرار دی گئی۔ اس کے بعد جب مسلمانوں نے ہندوستان فتح کر لیا تو فارسی زبان کو سرکاری و عدالتی زبان کا درجہ حاصل ہوا اور اب جب سے انگریز ہم پر حکمران ہیں۔ انگریزی زبان ذریعہ تعلیم اور سرکاری و عدالتی زبان ہے۔ اور ہماری مادری زبانیں کسی خاص حیثیت کی مالک نہیں ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ ہندوستان اپنے رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے ایک براعظم ہے۔ اور اسے دنیا کی قوموں کا عجائب گھر کہنا بالکل درست ہے۔ اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہر صوبہ کی مادری زبان دوسرے صوبہ کی مادری زبان سے بہت مختلف ہے۔ گر بایں ہمہ ہمارے ملک میں ایک ایسی زبان بھی موجود ہے جو ہر گوشہ گوشہ میں جزوی اور بالکل معمولی اختلاف کے ساتھ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس زبان کا نام اردو یا ہندوستانی ہے۔ اور یہی زبان ہماری قومی و ملکی زبان بننے کی اہلیت رکھتی ہے۔

یہ تو ایک حقیقت ہے کہ ایک محکوم قوم حاکم قوم کی ہر بات اور ہر فعل میں نقل کرنا باعث فخر جانتی ہے۔ لباس۔ طرز بود و باش اور یہاں تک کہ زبان بھی فاتح قوم کی اختیار کر لیتی ہے۔ اسی وجہ سے تو اب تک ہمارے ہاں یورپین لباس میں ملبوس اور انگریزی زبان میں بات کرنے والوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور ہمیں انگریزوں کی ہر بات خواہ وہ کسی قدر معیوب کیوں نہ ہو اچھی لگتی ہے اور یہ وجہ ہے ہماری غلامانہ اور پست ذہنیت کی۔ اور گو ہمیں اپنے حاکموں کی نقل اتارنے میں بہت سی مالی و دیگر قربانیاں کرنی پڑتی ہیں مگر ہم افسوس و فکر کے ساتھ نہیں بلکہ فخر کے ساتھ یہ قربانیاں کرتے ہیں۔

چونکہ ہم غلام اور محکوم ہیں اس لئے ہماری تعلیم کا ذریعہ ہماری مادری زبان نہیں بلکہ ایک غیر ملکی زبان ہے اور وہی زبان سرکاری اور عدالتی ہے یعنی عدالتوں اور سرکاری محکموں کی کارروائیاں غیر ملکی زبان میں ہوتی ہیں۔ اور اس معاملہ میں ہماری ذہنیت اس قدر غلامانہ اور پست ہو چکی ہے کہ گو ہم میں سیاسی بیداری پیدا ہو چکی ہے اور ہم ایک کافی طویل مدت سے غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لئے سرتوڑ جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہم اپنے ملک کی صنعت و حرفت کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ اور ہمیں تلقین کی جاتی ہے کہ انگریزی وضع کا لباس نہ پہنیں اور غیر ملکی مال استعمال نہ کریں۔ لیکن اس بات کا کسی کو خیال نہیں کہ غیر ملکی زبان (جو ہماری پیشانی پر ہماری غلامی کا سب سے بڑا سیاہ داغ ہے) چھوڑ کر اپنی مادری زبان اختیار کریں۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی انگریزی میں گفتگو کرنا۔ انگریزی میں تقریر کرنا۔ انگریزی میں خط و کتابت کرنا۔ انگریزی زبان کے اخبار و کتابیں پڑھنا اور اپنی مادری زبان کو نظر حقارت سے دیکھنا اور اپنی مادری زبان میں لکھی ہوئی کتابوں اخباروں اور رسالوں کو کوڑا کرکٹ سمجھنا سرمایہ ناز جانتے ہوئے

ہیں۔ اور حیرت تو یہ ہے کہ حریت و آزادی کے سب سے بڑے علم بردار اور سودیشی مال کا پرچار اور غیر ملکی چیزوں کے بائیکاٹ کی تلقین کرنے والے کانگریسی بھی جب کبھی گفتگو یا تقریر کرتے ہیں تو ایک غیر ملکی زبان میں۔ آج تک ہمیشہ کانگرس کے سالانہ اور دوسرے معمولی جلسوں میں تقریریں انگریزی زبان میں ہی کی گئی ہیں۔ کانگرس کی کارروائیاں انگریزی زبان میں ہی شائع ہوتی ہیں۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ہم عقل سے کام لیں۔ اور ایک غیر ملکی زبان کو سرمایۂ ناز سمجھ کر دنیا میں اپنی غلامی اور پست ذہنیت کا ڈھنڈورہ پیٹنے سے باز آجائیں۔

سیاسیات عالم سے واقف حضرات کو معلوم ہوگا کہ محکوم قومیں بیدار ہو گئی ہیں اور آزادی حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پیر چلا رہی ہیں۔ ہمیں بھی ان کی تقلید کرنی چاہیئے۔ اہل برما نے ہمارے لیئے ایک عمدہ مثال پیش کر دی ہے۔ گزشتہ ماہ مارچ کے آغاز میں جب برما کونسل کے جلسے ہوئے تو اس وقت نہ صرف وزیروں کے خلاف قرارداد پاس کی گئی اور انہیں مستعفی ہو جانے پر مجبور کیا گیا۔ سالانہ میزانیہ میں رد و بدل کرنے کی جدوجہد کی گئی بلکہ انہوں نے ایک قرارداد اس مطلب کی بھی پاس کی کہ آیندہ کونسل میں تقریریں غیر ملکی زبان میں نہیں بلکہ برمی زبان میں کی جائیں۔ کیا ہمارے ہم وطن برمیوں کے اس جذبہ آزادی کی قدر کرتے ہوئے ان کے نقش قدم پر چلنے کی سعی کریں گے۔

ہندوستان کا جدید دستور اساسی ہندوستانیوں نے نہیں بلکہ ان کے مطالبات اور خواہشات کے خلاف ان کے حکمرانوں نے بنایا ہے اور اس کی رو سے عدالتوں اور اسمبلیوں کی کارروائیاں انگریزی زبان میں ہی ہونی ضروری ہیں۔ اسمبلیوں کے ممبروں کو بھی اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ انگریزی کی بجائے اپنی مادری زبان میں تقریر کریں مگر ہر صوبہ کی اسمبلی کو اس بات کا اختیار ہوگا کہ وہ خاص خاص حالات میں ممبروں کو ان کی مادری زبان میں تقریر کرنے کی اجازت دے دیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ ابھی ایک مدت تک جدید دستور اساسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے مگر صدر اسمبلی کے اختیارات خصوصی سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اس بات کی توقع رکھنا تو یقیناً حماقت ہے کہ جدید دستور اساسی کے نافذ ہوتے ہی ہمارے مغرب زدہ سرکار پرست لیڈر اپنے حاکموں کی زبان ترک کرکے اپنی مادری زبان میں تقریریں کریں گے اس لیئے ہمارا روئے سخن ایسے لوگوں کی طرف نہیں بلکہ حریت پسندوں۔ آزادی کے طلب گاروں۔ سودیشی چیزوں پر قربان ہونے والوں اور برطانوی استعماریت کی بیخ کنی کرنے کے لیئے کوشاں لوگوں سے ضرور اس بات کی توقع ہے کہ وہ وقت اور ملک و قوم کی اس اہم ترین ضرورت کو محسوس کریں اور اپنے سب سے بڑے قومی فرض کو پہنچانتے ہوئے جہاں تک بن پڑے ایک غیر ملکی زبان کی بجائے اپنی قومی زبان کو فروغ دیں۔ غیر ملکی مال کی طرح غیر ملکی زبان کو بھی ٹھکرا دیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ایسا کرنے کی صورت میں ہمیں کافی قربانیاں کرنی اور نقصان بھی اٹھانا پڑے گا مگر یہ بھی یاد رہے کہ اس نوع کی قربانیاں کرنے اور نقصانات اٹھانے کے بغیر ہم آزادی کی دیوی سے ہمکنار بھی نہیں ہو سکتے ہیں۔ اور اگر ہم مصیبتیں اٹھانے اور قربانیاں کرنے کے لیئے تیار نہیں ہیں تو ہمارا جذبۂ آزادی ایک سراب ہے۔ دھوکا ہے۔ ہم اپنے نفس کو فریب میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔

سابق دستور اساسی کے زمانہ میں صوبجاتی کونسلوں اور مرکزی اسمبلی کے ممبر زیادہ تر وہی لوگ تھے جو تعلیم یافتہ

کہلاتے ہیں مگر اب رائے دہندوں کا حلقہ وسیع ہو گیا ہے اور معیار ممبری بھی گرا دیا گیا ہے اس لیئے ہر صوبہ کی اسمبلی میں بہت سے ایسے ممبر بھی ہیں جو انگریزی زبان سے ناواقف ہیں یا کم از کم انگریزی میں تقریر کرنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے ہیں۔ اندریں حالات اگر کسی صوبہ کی اسمبلی کے ممبروں کو ان کی اپنی مادری زبان میں تقریر کرنے کی اجازت نہ ملی تو غیر تعلیم یافتہ ممبروں کی ممبروں کی موجودگی یا عدم موجودگی بے معنی ہو کر رہ جائے گی اور اس طرح ان کے حقوق پائمال ہوں گے۔ قوم پرستوں کو چاہیئے کہ وہ اس سوال پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور ملک و قوم کی اس اہم ضرورت کو بھی پورا کرنے کی طرف فوری توجہ دیں۔

(سید محمود مورخ بی۔اے ایڈیٹر گلفروش)

# جاگ ہندوستان

(جناب عبدالرحیم شبلی۔ بی۔ کام)

زندگی کے کسی شعبہ کو دیکھا جائے ہندوستانی ہر بات میں پیچھے ہیں۔ کیا یہ تعجب خیز امر نہیں کہ دنیا تو ہوائی جہازوں پر اڑتی پھرے اور ہندوستان والے اپنے چھکڑوں اور گڈوں کو ربڑ ٹائر لگوانے سے بھی قاصر رہیں؛

ہماری معاشرتی رسوم مثلاً صغر سنی کی شادی۔ سنیاس چھوت چھات۔ پردہ اور بیاہ کا طریق ایسی باتیں ہیں کہ ہمیں اس مخمصے میں چھوڑ جاتی ہیں کہ کیا ہم بیسویں صدی میں رہ رہے ہیں؟

رفتارِ اموات اور رفتارِ پیدائش کا موازنہ کرو تو وہ علی الترتیب اٹھتیس اور پینتالیس فی ہزار بنتی ہے جو اس معیار سے جو ماہرینِ معاشیات نے مقرر کیا ہے کہیں پیچھے ہے ——!

تعلیم کی یہ حالت ہے کہ آٹھ یا دس فی صدی سے زیادہ لوگ سارے ہندوستان میں پڑھے نہیں ملتے اور عورتیں تو صرف دو فی صدی پڑھی ہوئی ہیں ——!

ہندوستان کے اکثر لوگوں کا پیشہ زراعت ہے جس کا انحصار بارش پر ہوتا ہے۔ اگر بارشوں میں کمی بیشی ہو جائے تو لوگ طرح طرح کے وساوس اور توہمات میں غرق ہو جاتے ہیں۔ دیوتاؤں کی مرضی۔ قسمت۔ نصیب۔ یہ الفاظ اکثر ان کی زبان پر جاری ہوتے ہیں۔

ملک میں اتنی مصنوعات نہیں کہ ہندوستان کافی بالذات ہو سکے۔ لہٰذا وہ دوسرے ملکوں کا دست نگر ہے۔

مذہب لوگوں کی تفریق کا باعث بن رہا ہے۔ اور ذرا ذرا سی باتوں پر وہ آپس میں سر پھٹول کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ آہ مذہب جیسی پاک چیز کو وہ کس قدر بدنام کر رہے ہیں! مذہب تو خدا نے اس لیئے دیا تھا کہ ہم روحانی طور پر اپنا ایک منتہی المقصود قرار دے کر اخوت۔ مساوات اور آزادی کا پرچار کریں۔ لیکن یہاں مذہب کی آڑ لیکر ہم تینوں کو ایک خواب قرار دے رہے ہیں!

ان سب پر مستزاد یہ کہ ہم پر ایک خارجی حکومت جو اپنی نسل۔ اپنی قوم۔ اپنی روایات۔ اپنی تہذیب۔ اپنے تمدن کے لحاظ سے ہم سے بالکل مختلف ہے ہم پر حکمرانی کر رہی ہے ——!

اے ہندوستان تو کب جاگے گا؟

# سودائے وطن

(جناب خواجہ فیض محمد صاحب لودھیانوی)

روحِ نظارہ ہیں گلہائے وطن　||　دلکش جنت ہے صحرائے وطن

محوِ حیرت ہو گئے اہلِ نظر　||　دیدنی ہے روئے زیبائے وطن

دیدۂ حق بیں سے آ کر دیکھئے　||　غیرتِ کوثر ہے دریائے وطن

دامن کہسار میں آب رواں　||　بن گیا ہے زینت آرائے وطن

خلد کی حسرت مبارک ہو تمہیں　||　ہم کو اچھی ہے تمنائے وطن

اشتیاقِ سیر میں شمس و قمر　||　روز و شب ہیں دشت پیمائے وطن

ہفت کشور تک نہ لیں اس کے عوض　||　صدق دل سے ہیں جو شیدائے وطن

عشق میں یکتا ہیں مجنوں کی طرح　||　ناز بردارانِ لیلائے وطن

دردمندانِ وطن کے ما سوا!　||　کون ہے اب چارہ فرمائے وطن

غیر بھی کرتے ہیں غم خواری یہاں　||　باعثِ راحت ہے ایذائے وطن

رنجِ غربت کو مٹانے کے لئے　||　مست ہو جا پی کے صہبائے وطن

اور کیا ہوگی غلاموں کی دعا　||　اے خدا آزاد ہو جائے وطن

ان کا دنیا میں کوئی پرساں نہ ہو　||　اس قدر ہوں خوار اعدائے وطن

چرخ سے ٹکرائے گی اُن کی صدا　||　یک زباں ہو جائیں ابنائے وطن

فیضؔ کے اشعار سے ظاہر ہوا
اس کے سر میں بھی ہے سودائے وطن

# مہاراجہ رنجیت سنگھ

(گزشتہ سے پیوستہ)

## مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دربار

مہاراجہ میں مردم شناسی کا جوہر بہت زیادہ موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کو مہاراجہ نے اپنی ملازمت عطا کی انہوں نے نہایت قابلیت اور وفاداری سے اپنے آقا کی خدمت کی۔ رنجیت سنگھ سے تھوڑا عرصہ قبل سکھ عوام برہمنوں اور مسلمانوں سے بجد نفرت کرتے تھے۔ حتیٰ کہ انہیں سلام کرنے کے بھی روادار نہ تھے۔ باوجود اس کے مہاراجہ نے برہمنوں کھتریوں اور مسلمانوں کو بڑے سے بڑے عہدے دے رکھے تھے۔

## فقیر عزیز الدین

فقیر عزیز الدین مہاراجہ کے وزیر خارجہ تھے۔ دراصل فقیر عزیز الدین طبابت پیشہ تھے اور اسی حیثیت سے سب سے پہلے رنجیت سنگھ سے تعلقات قائم ہوئے۔ رنجیت سنگھ فقیر عزیز الدین کی دانشمندی کے بجد قائل تھے اور ہر اہم معاملہ میں ان کا مشورہ لینا ضروری سمجھتے تھے۔

سکھ زیادہ تر زراعت پیشہ تھے۔ ان سے لڑائی کا کام تو لیا جا سکتا تھا لیکن ملکی معاملات ان کے سپرد نہیں کئے جا سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ملکی معاملات سے متعلق تمام امور ہندوؤں یا مسلمان وزیروں کے سپرد کئے ہوئے تھے لیکن فوج میں زیادہ تر سکھ افسر ہی ہوتے تھے۔ مہاراجہ کو فقیر عزیز الدین کی ذات پر اس قدر اعتماد ہوتا تھا کہ خود تمام فوج کو لے کر دور دراز کی مہمات پر روانہ ہو جاتے اور فقیر صاحب کو دارالخلافہ (لاہور) کے تمام انتظامات سپرد کر دیتے۔ یہی نہیں بلکہ لارڈ ولیم بنٹنک اور امیر دوست محمد خان (امیر افغانستان) کے پاس بھی فقیر عزیز الدین کو ہی اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ تمام مورخ اس امر پر متفق ہیں کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے تمام وزراء میں فقیر عزیز الدین سب سے لائق اور قابل اعتماد تھے۔

فقیر عزیز الدین بجد وسیع المشرب اور صوفی منش انسان تھے۔ اس کے علاوہ تحریر و تقریر میں کامل ذریعہ رکھتے تھے اور فصاحت و بلاغت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ مہاراجہ نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ ہندو مذہب کو اچھا سمجھتے ہیں یا اسلام کو۔ فقیر صاحب نے جواب دیا۔

"میری مثال اس شخص کی ہے جو ایک عظیم الشان دریا میں تیر رہا ہو۔ میں اپنے دائیں دیکھتا ہوں اور بائیں طرف بھی نظر ڈالتا ہوں لیکن دونوں طرف کناروں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا"۔

فقیر عزیز الدین ایک نہایت بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ آپ اپنے اشعار میں بھی صوفیانہ خیالات کو ہی بیان کرتے تھے۔ آپ علم دوست ہی نہ تھے بلکہ علم پرور بھی تھے۔ چنانچہ لاہور میں اپنے خرچ سے عربی فارسی کی تعلیم کے لئے ایک اعلےٰ پایہ کا کالج جاری کیا تھا۔

۱۸۴۵ء یعنے مہاراجہ کے انتقال کے چھ سال بعد فقیر عزیز الدین کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کے علاوہ مہاراجہ کے

معزز درباریوں میں نواب مظفر خان والئے ملتان کے بیٹے نواب سرفراز خان اور نواب ذوالفقار خان بھی تھے۔ جب مہاراجہ نے قلعہ ملتان کا محاصرہ کیا تو بوڑھے نواب مظفر خان نے شمشیر بکف نہایت دلیری سے قلعہ کی محافظت کی تھی اور آخر اس کوشش میں جان دے دی تھی۔ مہاراجہ بوڑھے نواب کی بہادری سے ایسے متاثر ہوئے کہ اس کے بیٹوں کو اپنے ساتھ لاہور لے آئے اور نہایت عزت و احترام سے رکھا۔

## جمعدار خوشحال سنگھ

مہاراجہ کے محبوب درباریوں میں جمعدار خوشحال سنگھ کو بھی ممتاز درجہ حاصل تھا۔ کہتے ہیں کہ خوشحال سنگھ سولہ سال کی عمر میں گھر سے بغرض روزگار لاہور آیا اور پانچ روپیہ ماہوار پر فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اور جلد ہی ترقی کرکے خاص مہاراجہ کے حفاظتی دستہ میں تعینات کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مہاراجہ بہادر بھیس بدل کر قلعہ سے باہر گئے واپسی پر جمعدار خوشحال سنگھ نے مہاراجہ کو اندر جانے سے روکا اور صبح ہونے تک مہاراجہ کو قلعہ سے باہر ڈیوڑھی میں ٹھیرائے رکھا۔ مہاراجہ جمعدار کی اس مستعدی اور فرض شناسی سے بہت خوش ہوئے اور اس کو اپنے مقربوں میں جگہ دے کر وزیر محلات مقرر کر دیا۔ ۱۸۳۲ء میں مہاراجہ نے اس کو کشمیر کا گورنر مقرر کر دیا لیکن چونکہ یہ رشوت بہت لیتا تھا بہت بدنام ہوا اور آخر مہاراجہ نے اسے واپس بلا لیا۔

جمعدار خوشحال سنگھ کا بھتیجا تیج سنگھ بھی مہاراجہ کی ملازمت میں آ گیا تھا۔ اس نے بھی خوب ترقی کی حتیٰ کہ سکھوں انگریزوں کی پہلی لڑائی میں سکھ افواج کا سپہ سالار اعظم یہی تیج سنگھ تھا۔ لیکن مشہور ہے کہ اس نے انگریزوں سے ساز باز کرکے سکھ افواج کو تباہ کرا دیا تھا۔

## ہری سنگھ نلوہ

مہاراجہ کا سب سے مشہور اور قابل ترین فوجی جرنیل ہری سنگھ نلوہ تھا۔ یہ مہاراجہ کا ہموطن یعنے گوجرانوالہ میں پیدا ہوا تھا۔ ہری سنگھ نلوہ جنگی چالوں کو سمجھنے میں کمال رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے بڑی مہمات پر مہاراجہ نے اسی کو بھیجا تھا۔ چنانچہ فتح ملتان میں بھی اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس کو کشمیر، ہزارہ جات اور پشاور کا گورنر بھی مقرر کیا گیا لیکن انتظامی امور میں اس کو مہارت حاصل نہ تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا یہ قابل اعتماد اور مشہور جرنیل پشاور کے مقام پر افغانوں کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے ۱۸۳۷ء میں مارا گیا۔

## راجہ دینا ناتھ

مہاراجہ کی زندگی کے آخری ایام میں راجہ دینا ناتھ نے بہت رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ اس کے سپرد محکمہ مال تھا۔ تدبر اور معاملہ فہمی میں بہت کم لوگ اس کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ دربار میں بڑے بڑے انقلابات ہوئے۔ مشہور اور با اختیار اشخاص سازشوں اور حاسدوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے قعر مذلت میں گرائے گئے لیکن راجہ دینا ناتھ کا ہر قدم ترقی اور دولت کی طرف ہی پڑتا تھا۔ راجہ صاحب پہلے ہی تاڑ جاتے تھے کہ اب فلاں فریق یا فلاں شخص کا ستارہ غروب ہونے والا ہے۔ آپ پیش بندی کے طور پر پہلے ہی اس شخص یا فریق کا ساتھ چھوڑ دیتے۔ اور ایسے شخص یا اشخاص سے تعلق جوڑ لیتے جو مہاراجہ کی نظروں میں معتبر قرار پاتے۔

۱۸۳۴ء میں راجہ دینا ناتھ کو مہاراجہ نے وزیر مالیات مقرر کیا۔ مہاراجہ کے انتقال کے بعد بھی یہ عہدہ آپ کے پاس ہی رہا۔ اور جب لاہور انگریزوں کے قبضہ میں آیا تو

راجہ صاحب کو کونسل آف ریجنسی کا ایک ممبر مقرر کیا گیا۔ اس میں آپ نے انگریزوں کی شاندار خدمات سرانجام دیں۔

## سردار لہنا سنگھ

سردار لہنا سنگھ مجیٹھ کے مشہور سکھ خاندان سے تھے اس کو حسام الدولہ یعنے سلطنت کی تلوار کا خطاب ملا ہوا تھا۔ اس کا دماغ مشین سازی میں خوب لڑتا تھا چنانچہ اس نے کئی ایجادیں بھی کی تھیں۔ اس نے ایک ایسا کلاک تیار کیا تھا جس میں گھنٹوں کے علاوہ دن اور چاند کی حرکات کی بابت بھی اطلاع ملتی تھی۔ اس کو علم ہیئت، ریاضی میں بڑی مہارت تھی اور فارسی کے علاوہ کئی اور زبانوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔

لہنا سنگھ نہایت رحمدل، انصاف پسند اور غریبوں کا حامی تھا۔ مہاراجہ کے دربار میں خود غرض، لالچی اور رشوت لینے والے لوگ بکثرت تھے۔ ایک لہنا سنگھ ایسا تھا جس کا ہاتھ ایسی برائیوں سے پاک و صاف رہا۔

## راجہ گلاب سنگھ

راجہ گلاب سنگھ، راجہ دھیان سنگھ اور راجہ سچیت سنگھ ڈوگرہ قوم سے تھے۔ اور محض محنت اور استقلال کی بدولت ادنٰے درجہ سے ترقی کر کے مہاراجہ کے ماتحت اعلےٰ سے اعلےٰ درجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

دھیان سنگھ نے مہاراجہ کی زندگی میں ہی جمعدار خوشحال سنگھ کی جگہ وزیر محلات کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ اور کچھ عرصہ تک تو عملی طور پر وزیر اعظم کے فرائض بھی سرانجام دیتا رہا۔ لیکن مہاراجہ کے مرنے کے بعد دربار کی سازشوں کا شکار ہو کر قتل کیا گیا۔

اس کے بڑے بھائی راجہ گلاب سنگھ نے سکھوں اور انگریزوں کی پہلی جنگ میں کچھ اس قسم کی خدمات سرانجام دیں کہ ۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے اسے جموں و کشمیر کا خود مختار حکمران بنا دیا۔ چنانچہ مذکورہ علاقے اب تک راجہ گلاب سنگھ کی اولاد کی تحویل میں چلے آتے ہیں۔

(مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج اور دیگر انتظامی معاملات کے حالات آئندہ پرچہ میں درج کئے جائیں گے۔)

# جاپان کا سیاسی مذہب

یوں تو جاپان میں کنفیوشس، بدھ اور شنتو مذہب کے پیرو پائے جاتے ہیں اور حال ہی میں ایک معتد بہ تعداد نے عیسائی مذہب بھی اختیار کر لیا ہے لیکن تمام جاپانیوں کا سیاسی مذہب ایک ہی ہے یعنی "بادشاہ پرستی"۔ اگرچہ بادشاہ پرستی کے جذبہ کا اظہار زیادہ تر جنگ روس و جاپان (۱۹۰۵ء) کے بعد ہی ہوا لیکن اس کی بنیاد اس زمانہ سے بہت پہلے ڈالی جا چکی تھی۔ جاپانی حکومت کے مختلف ادارے بالخصوص محکمہ فوج والے بادشاہ پرستی کے جذبہ کو پیدا کرنے کے لیئے بڑی کوشش کر رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جاپان کی متحدہ قومیت کے لیئے اس سے بڑھ کر کوئی آسان تر حربہ موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر خیال کے جاپانی اس جذبہ کی افزائش میں کوشاں رہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ جاپان کے اشتراکی خیال رکھنے والے اس کے خلاف ہیں لیکن اسی بادشاہ پرستی کے جذبہ کی فراوانی کی وجہ سے وہاں پر اشتراکی خیال رکھنے والوں کو ہر ممکن ذریعہ سے دبانے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کا نتیجہ ہے کہ اب وہاں پر بہت لوگ ایسے ہیں جو علانیہ اپنے اشتراکی خیالات کا اظہار کر سکیں۔

جاپان کے سیاسی مذہب کا لب لباب یہ ہے کہ ہر محب وطن کا فرض ہے کہ وہ شہنشاہ کی ذات اور ملک کے لیئے اپنی جان تک دے دے۔ اس کے لیئے اس جذبہ کی تکمیل کے سوا بڑھ کر اور کوئی چیز سرمایہ افتخار نہیں ہو سکتی۔ اس جذبہ کو قائم رکھنے کیلئے محکمہ فوج کی طرف سے مسلسل کوشش جاری رہتی ہے اور محب وطن اور ایثار پیشہ لوگوں کی مثالوں کی تشہیر وسیع پیمانہ پر جاری رکھی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جاپانی فوجیوں میں ایسا جوش اور مرنے کے لیئے ایسا جذبہ پیدا ہو چکا ہے جس کی مثال سوائے ایک دیوانہ شخص کے اور کہیں مشکل سے ملے گی۔ ایک مغربی مبصر جاپانی فوجی کا نقشہ کھینچتا ہوا لکھتا ہے کہ

"اس میں فرانسیسیوں کا جوش و خروش، انگریزوں کی سی خود اعتمادی، روسیوں کی سی جفاکشی، جرمنوں والی تنظیم اور میدان جنگ میں ترکوں جیسی بہادری پائی جاتی ہے۔"

چنانچہ جب جاپانی فوجیوں کی بے مثال قربانی اور ایثار کی مثالوں کو دیکھا جاتا ہے تو جاپانی فوجی کی نسبت جو نقشہ اوپر کھینچا گیا ہے اس کی سچائی میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

جاپان و چین کی گزشتہ جنگ (۱۹۳۲ء) کے دوران میں ایک جاپانی افسر فوج میجر کوگا کی نسبت یہ خیال کیا گیا کہ وہ جنگ میں مارا جا چکا ہے لیکن جب بعد میں وہ زندہ نمودار ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ جنگ کے دوران میں زخمی ہو کر بیہوش ہو گیا تھا جس حالت میں چینی اس کو گرفتار کر کے لے گئے۔ فوجی عدالت نے اس واقع کو مدنظر رکھتے ہوئے نیکنامی کے ساتھ اس کو بری کر دیا لیکن میجر مذکور نے خودکشی کر لی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ دشمن کے ہاتھوں قید ہو جانے کی بدنامی کا دھبہ جان دیئے بغیر دور نہیں ہو سکتا۔ میجر کوگا کی خودکشی پر اظہار رائے کرتے ہوئے جاپان کے سابق وزیر جنگ جنرل اراکی نے اخبارات میں لکھا کہ

"میجر کوگا نے اپنی جان دے کر جاپانی فوجیوں پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ حالات خواہ کچھ ہی ہوں لیکن جاپانی فوجی ایک مرتبہ دشمن کے ہاتھ قید ہو جانے کے بعد عزت و آبرو کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ جب تک جاپانی فوج میں میجر کوگا جیسا جذبہ رکھنے والے لوگ موجود ہیں اس وقت تک جاپانی فوج دشمن کی ہر فوج کو آسانی سے شکست دے سکتی ہے۔"

جاپان میں بدھ مت اور کنفیوشش مذہب اور عیسائیت باہر سے آئے ہیں البتہ شنٹو مذہب خاص جاپان کی پیداوار ہے۔ اس مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ بادشاہ سورج دیوتا کی اولاد میں سے ہے نیز یہ کہ بادشاہ کے ساتھ ایسی سچی محبت کرنی چاہیئے جیسے کہ اولاد ماں باپ کے ساتھ کرتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بادشاہ کی خاطر اپنی محبوب ترین چیزیں حتیٰ کہ اپنی جان بھی قربان کر دی جائے۔ دور حاضرہ کے عام رجحان کے ماتحت شنٹو مذہب کا اثر جاپانی عوام پر سے بتدریج کم ہو رہا تھا لیکن حکمران طبقہ اپنے مفاد نیز قومی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے نئے سرے سے اس میں تازہ روح پھونکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جاپانی جانتے ہیں کہ جس قدر اس مذہب کو فروغ ہوگا اسی نسبت سے بادشاہ پرستی کا جذبہ پھیلے گا اور جب تک یہ جذبہ موجود ہے کوئی طاقت ان کی قوت کو توڑ نہیں سکتی۔

شاہ پرستی کا جذبہ جاپان میں بجائے کم ہونے کے روزافزوں ہے چنانچہ موجودہ جاپان کی تمام سیاسی، اقتصادی، معاشرتی تحریکات اس جذبہ کی مرہون منت ہیں مثلاً جنرل اراکی اپنی کتاب "جاپان کی شہنشاہی افواج" میں عالمگیر اقتصادی بدحالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"ہم یورپ اور امریکہ والوں کی نقل کرتے ہوئے انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب عالمگیر کساد بازاری کا دور ختم ہوتا کہ ہماری مشکلات بھی دور ہوں لیکن ہم یہ بھول گئے تھے کہ ہم ایشیائی قوم ہیں ہمیں اپنے حالات کے مطابق اقتصادی بدحالی کا علاج بھی خود اپنی قوت بازو سے کرنا چاہیئے۔"

جاپان نے اپنے ملک کی اقتصادی بدحالی کو دور کرنے کا حل خوب سوچا کہ مشین گنوں اور ہوائی جہازوں کے زور سے مانچوریا کو چین سے علیحدہ کر کے وہاں اپنی حکومت جمائی جائے تاکہ وہاں کی زرخیز اراضی اور معدنی کانوں سے اپنے ملک کی ضروریات کو پورا کیا جائے۔ اقتصادی بدحالی کے اس انوکھے علاج کو آخر تک پہنچانے کے لیئے جاپانی سیاسیات نے ایک بالکل نیا جامہ زیب تن کر لیا ہے چنانچہ اب "اقتصادی بدحالی کا علاج" والے الفاظ کو ترک کر کے کھلم کھلا یہ کہا جانے لگا ہے کہ

"چین اور تمام مشرقی ایشیا میں امن قائم کرنے کا کام جاپانی قوم کا مقدس فرض ہے جس میں کسی غیر ملکی طاقت کو دخل دینے کا اختیار نہیں۔"

اس "مقدس فرض" کی تکمیل کے لیئے ضروری ہے کہ چین کو جاپان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ حتیٰ کہ غیر ممالک والے اس ملک میں تجارت کے لیئے بھی پہلے جاپان سے اجازت نامہ حاصل کریں۔ اسی "مقدس فرض" کو مدنظر رکھتے ہوئے چین کو یہ بھی کہا گیا کہ وہ اپنی فوجوں کی تربیت اور نگرانی کے لیئے جاپانی افسر رکھے یہی نہیں بلکہ چین کے اندرونی انتظامات کے لیئے بھی جاپانی امداد حاصل کی جائے" وغیرہ وغیرہ دنیا کی رائے عامہ اور چینیوں کی مخالفت کی بنا پر اس مطالبہ کو منوانے کے لیئے زور نہیں دیا گیا لیکن اس مطالبہ سے ظاہر ہے کہ

جاپان کا سیاسی مذہب آج کل یہ ہے کہ چین اور تمام مشرقی ایشیا پر اپنی حکومت قائم کر دی جائے۔

کسی مذہب کی استواری اور پختگی کے لئے ایک کتاب کا ہونا بھی بنیادی امور میں سے ہے سو جاپانی حکام کو "سیاسی مذہب" کے استحکام کے لیے اس امر میں بھی کوئی زیادہ مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ شہنشاہ میجی کے فرامین کو بطور ایک سند اور کتاب کے پیش کر دیا ہے اور جاپانیوں نے اسے بلا تردد قبول بھی کر لیا ہے۔

یہ فرامین جاپان کے شہنشاہ میجی نے ۱۸۸۲ء میں صادر کئے تھے۔ پہلا فرمان یہ ہے کہ "فرمانبرداری ہر فوجی کا فرض ہے۔ دوسروں کی آراء اور سیاسی رجحانات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر فوجی کو لازم ہے کہ وہ بلا چون وچرا بادشاہ کی مرضی کو پورا کرنے کو اپنا فرض قرار دے۔ اس فرض کو پہاڑوں سے بڑا اور اس فرض کی انجام دہی میں موت کو ایک تنکے سے زیادہ ہلکا تصور کرنا چاہیئے۔ اور اس مقدس فریضہ کی بجا آوری میں بڑی سے بڑی مصیبت کو خاموشی اور سکون سے برداشت کرنا چاہیئے"

دوسرا فرمان یہ ہے کہ "ہر فوجی کے لیئے ضروری ہے کہ وہ بے چون و چرا اپنے افسروں کا حکم مانے۔ جو فوجی اس فرمان کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کو ملک کے لیئے ایک زہر تصور کرنا چاہیئے"

غرضیکہ اسی طرح متعدد فرامین ہیں جن میں سول اور فوجی ملازمین کو اپنے افسران کی فرمانبرداری اور بادشاہ کی اطاعت کی سخت ترین الفاظ میں تاکید کی گئی ہے۔

جاپان کے سیاسی مذہب کا مقصد یہ ہے کہ عوام اور سرکاری ملازمین کو اس طرح تربیت دی جائے کہ وہ عادتاً حکومت کے ہر حکم کی تعمیل کریں۔ اور ان مقاصد کو جو حکومت کی مضبوطی اور ملک کی بہبودی سے تعلق رکھتے ہیں مذہب اور اخلاق کا جامہ پہنا یا گیا ہے۔ حتیٰ کہ مانچوریا کی فتح اور چین کے ساتھ جنگ کو بھی جاپانی ایک اخلاقی فرض قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا نے جاپانیوں کو ایک روحانی طاقت عطا کی ہے پس ان کا فرض ہے کہ دوسروں کو بھی اس سے حصہ دیں۔ جاپانیوں کا اعتقاد ہے کہ جب تک وہ اپنی روحانی برتری کا سکہ چین اور مشرقی ایشیا پر نہیں جمائیں گے اس وقت تک ایشیا بلکہ تمام دنیا میں امن کا قیام محال بلکہ ناممکن ہے۔

(غلام محمد خاں بی۔ اے)

# پانی پت کی آخری لڑائی

پانی پت کی آخری جنگ احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان ۱۷۶۱ء میں لڑی گئی۔ پنڈت کاشی رائے نواب شجاع الدولہ وزیر اودھ کے ہمراہ میدان جنگ میں موجود تھا۔ اس کے تحریر کردہ افواج کی تعداد اور لڑائی شروع ہونے تک کے حالات ساربان کے گزشتہ پرچہ میں درج کئے گئے تھے۔ وقائع مذکور کے آخری حصہ کا خلاصہ ہم ذیل میں ہدیۂ ناظرین کرام کرتے ہیں۔

(ایڈیٹر)

مرہٹہ افواج کی پیش قدمی کی خبر سن کر شاہ نے جو گھوڑے پر سوار حقہ پی رہا تھا۔ حقہ اپنے نوکر کے سپرد کیا اور نہایت سکون قلب کے ساتھ شاہ پسند خاں کو نجیب الدولہ کے بائیں طرف اپنی افواج کو ترتیب دینے کا حکم دیا۔ وزیر اعظم نے اپنی افواج کو قلب (یعنی وسط) میں رکھا۔ اسی طرح برخوردار خان اور دوسرے سرداروں نے اپنی اپنی جماعتوں کو حافظ رحمت خان اور احمد خان بنگش کے دائیں جانب کھڑا کیا۔ جب صفیں مرتب ہو چکیں شاہ ابدالی نے جنگی نقارہ بجنے کا حکم صادر کیا۔

اب دن کی روشنی میں مرہٹہ افواج پیش قدمی کرتے ہوئے دکھائی دیتی تھیں۔ سب سے آگے توپ خانہ تھا۔ مرہٹہ افواج کا رُخ مشرق کی جانب تھا اور ان کی ترتیب حسب ذیل تھی:۔

ابراہیم خان گاردی (افسر توپخانہ) دماجی گائیکواڑ، شودیو پٹیل، جسونت راؤ، شمشیر بہادر، ملہار راؤ، جنکوجی سندھیا اور خود بھاؤ، وشواس راؤ اور سواروں کے دستہ خاص کے ہراول یعنی سامنے کی صفوں میں تھا۔ انسانی صفوں کے آگے توپیں ترتیب دی گئی تھیں۔

شاہ ابدالی کی افواج کا رُخ مغرب کی جانب تھا۔

شاہ پسند خان، نجیب الدولہ، شجاع الدولہ، شاہ ولی خان وزیر اعظم، احمد خان بنگش، حافظ رحمت خان، دوندی خان، امیر بیگ خان، برخوردار خان اور دوسرے ایرانی اور مغل سردار سامنے کی قطاروں میں تھے۔ برخوردار خان، امیر بیگ اور دوندی خاں کے دستے مرہٹہ توپخانہ سے قریب تر تھے۔ شاہ ابدالی کی فوج اور مرہٹہ فوج کا درمیانی فاصلہ تقریباً آٹھ میل تھا۔ اور لڑائی میں حصہ لینے والی افواج کی تعداد حسب ذیل تھی۔

**مرہٹہ افواج** سوار فوج پچپن ہزار۔ پیادہ فوج پندرہ ہزار پنڈاری پندرہ ہزار۔ کل میزان پچاسی ہزار۔ لیکن ان کے علاوہ تقریباً تین لاکھ حاشیہ بردار تھے جن میں سے تقریباً دو لاکھ جنگ میں ہلاک ہو گئے۔

**شاہ ابدالی کی فوج** سوار فوج اکتالیس ہزار۔ پیادہ فوج اڑتیس ہزار۔ کل میزان اناسی ہزار۔ افغان فوج کے حاشیہ برداروں کی تعداد بھی تقریباً تین لاکھ تھی۔

## جنگ کا آغاز

۷۔ جنوری ۱۷۶۱ء طلوع آفتاب کے بعد توپوں اور بندوقوں کی گونج پیدا ہوئی۔ افغان فوجوں کی پیش قدمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کی توپوں کے گولے ان کے سروں پر سے گذر جاتے تھے اور نقصان بہت کم ہوتا تھا۔ افغان فوج

کی طرف سے توپوں کا بہت کم استعمال کیا گیا اور وہ بھی شاہ ولی خان کے دستہ کی طرف سے۔

دونوں فوجیں ایک دوسرے کی طرف پیش قدمی کر رہی تھیں۔ عین اس موقع پر ابراہیم گاردی بھاؤ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کر کے کہنے لگا:۔

"مدت ہوئی کہ آپ مجھ سے اس امر پر ناراض ہیں کہ میں فوجوں میں باقاعدہ تنخواہ کی تقسیم کے لیے کیوں زور دیتا ہوں۔ حال ہی میں آپ کے خزانہ کو لوٹا گیا اور ہمیں تنخواہ بالکل نہیں ملی۔ لیکن کوئی پروا نہیں۔ آج کے روز میں آپ کو قائل کرا دوں گا کہ باوجود استحقاق کے ہمیں تنخواہ نہیں دی گئی۔"

یہ کہہ کر ابراہیم خان گاردی نے گھوڑے کو مہمیز دی اور اپنی فوج میں پہنچ کر خود جھنڈا اٹھایا اور نشانوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ اور دو دستوں کو برخوردار خاں اور امیر خاں کو روکنے کے لیے چھوڑ کر باقی سات دستوں کو حافظ رحمت خاں کی فوج پر نیزوں کے ساتھ حملہ کرنے کا حکم دیا۔ فریقین نے نہایت بہادری اور جرأت کا ثبوت دیا اور عرصہ تک دست بدست لڑائی ہوتی رہی۔ ابراہیم گاردی کے اس حملہ سے تقریباً آٹھ ہزار بہادر روہیلے ہلاک یا زخمی ہو گئے۔ حافظ رحمت خاں بیمار تھا اس لیے پالکی میں بیٹھا ہوا تھا۔ برخوردار خاں اور امیر خاں کی افواج نے آگے بڑھنے کی بہت کوشش کی مگر ان کے ہر حملہ کو سختی سے روک دیا گیا لیکن اس دست بدست کی لڑائی میں جو تین گھنٹہ تک جاری رہی ابراہیم خاں گاردی کی افواج کے چھ دستے بالکل تباہ ہو گئے۔ اور وہ خود بھی نیزوں اور گولیوں کے زخموں سے چور ہو گیا تھا۔

بھاؤ نے جو دس ہزار سوار اور فوج خاص کے ساتھ مرکز میں تھا۔ شاہ ولی خان کی فوج پر اس زور سے حملہ کیا کہ اس کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے تین ہزار افغانوں کو تہ تیغ کر دیا۔ مقتولوں میں وزیر اعظم کا بھتیجا عطائی خان بھی تھا جس نے گوبند پنڈت کو شکست دینے میں بے نظیر بہادری کا اظہار کیا تھا۔ یہ صورت حالات دیکھ کر شاہ ولی خاں جو پورے طور پر مسلح تھا۔ پیدل لڑنے کے لیے گھوڑے پر سے نیچے اتر پڑا۔ نواب شجاع الدولہ نے مجھے (کاشی رائے) شاہ ولی خاں کے پاس بھیجا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مایوس اور ساتھیوں کے فرار ہو جانے پر سخت تکلیف اور غصہ میں ہے۔ وہ اپنے آدمیوں کو کہہ رہا تھا "دوستو! ہمارا ملک بہت دور ہے۔ تم بھاگ کر کہاں جاؤ گے" لیکن اس کے آدمی پریشان ہو ہو کر بھاگ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر شاہ ولی خان نے کہا "میرے بیٹے نواب شجاع الدولہ کو کہو کہ اگر وہ فوراً میری مدد کو نہ آئے گا تو میری ہلاکت یقینی ہے۔"

نواب کی فوج دو ہزار سواروں اور ایک ہزار بندوقچیوں اور بیس توپوں پر مشتمل تھی۔ دشمن کی فوج نزدیک اور حملہ کرنے والی تھی اس لیے نواب شجاع الدولہ وزیر اعظم کی مدد کے لیے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ نواب کے بائیں جانب نجیب الدولہ روہیلہ تھا جس کے پاس آٹھ ہزار پیادے اور چھ ہزار سوار تھے۔ اس کی فوج کے کثیر تعداد بیلدار ریت سے بھری ہوئی بوریوں کی دیوار کھڑی کرتے تھے اور جب فوج اس کی پناہ میں آ جاتی تو بیلدار تھوڑے فاصلہ پر آگے بڑھ کر ایک اور اسی قسم کی دیوار کھڑی کر دیتے اس تدبیر سے تمام فوج آہستہ لیکن بتدریج ایک کوس کے فاصلہ تک بڑھ گئی۔ نجیب الدولہ حیرت انگیز پھرتی اور قابلیت کا اظہار کر رہا تھا اور یہ کہتا سنائی دیتا تھا کہ آج کے روز کے نتیجہ کی بابت سب سے زیادہ دلچسپی مجھے ہے اس لئے سب سے زیادہ کوشش بھی مجھے کرنی چاہیئے۔ اس کے مقابلہ میں جنکوجی سندھیا تھا اور ان دونوں میں جانی دشمنی تھی۔ ابدالی فوج کا بہادر جرنیل شاہ پسند خاں نجیب الدولہ کے دائیں جانب

تھا اس سے [illegible] مرہٹوں کو اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکی۔

جنگ بدستور دوپہر تک جاری رہی اگرچہ درانی فوج کا جانی نقصان بہت کم ہوا لیکن بحیثیت مجموعی مرہٹوں کا پلہ بھاری معلوم ہوتا تھا۔ ایک بجے بعد دوپہر شاہ ابدالی نے اپنی فوج کے تمام بقایا سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ بھی جنگ میں حصہ لیں اور اس طرح سات آٹھ ہزار تازہ دم سپاہی شاہ ولی خان کی امداد کو آن پہنچے۔ ان کی مدد سے اس نے مرہٹوں کی فوج کے اس حصہ پر حملہ کیا جس کی قیادت بھاؤ خود کر رہا تھا۔ اس کے دائیں اور بائیں شاہ پسند خان اور نجیب الدولہ تھے جنہوں نے مل کر مرہٹہ فوج پر قیامت ڈھا دی۔ ایک گھنٹہ تک نیزوں۔ برچھیوں اور تلواروں سے دست بدست لڑائی ہوتی رہی۔ دو اور تین بجے کے درمیان وشواش راؤ (پیشوا کا لڑکا) زخمی ہو کر گھوڑے پر سے اُتر پڑا۔ لیکن بھاؤ کے حکم سے اسے ہاتھی پر بٹھا دیا گیا اور فوج کی قیادت بھاؤ بذات خود کرنے لگا لیکن آدھ گھنٹہ کے اندر اندر دفعتہً تمام مرہٹہ افواج نے مُنہ پھیر کر میدان جنگ کو غنیموں سے پٹا ہوا چھوڑ کر بھاگنا شروع کر دیا۔ ان کا منہ پھیرنا تھا کہ ابدالیوں نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ اور دس دس کوس تک جو مرہٹہ نظر آیا اسے تہ تیغ کر دیا۔ مرہٹہ فوج میں عورتوں اور بچوں سمیت پانچ لاکھ آدمی تھے لیکن ان میں سے اکثر یا تو قتل کر دیئے گئے یا قیدی بنا لئے گئے۔ جو مرہٹے ابدالیوں کے ہاتھ سے بچے ان کو کسانوں اور زمینداروں نے قتل کر ڈالا۔

فاتح فوج کے ہاتھ جو مال غنیمت آیا اس کا کوئی شمار نہیں ہو سکتا۔ ایک ایک سوار چھ چھ سات سات اونٹ مال و اسباب کے لادے ہوئے نظر آتا تھا اور اونٹوں اور گھوڑوں کی تعداد اتنی تھی کہ ان کو بھیڑوں اور بکریوں کی طرح ہانکتے تھے۔ ان کے علاوہ کثیر تعداد ہاتھی بھی قابو میں آئے۔ زندہ قیدیوں کی تعداد چھیالیس ہزار تھی۔ نواب شجاع الدولہ نے قیدیوں کی حفاظت کی لیکن جو لوگ خاص ابدالی فوجوں کے ہاتھ آئے ان میں سے اکثر کو قتل کر ڈالا گیا۔

جنگ کے خاتمہ پر سرداروں نے جمع ہو کر احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں نذریں پیش کیں اور اس کو مبارکباد دی۔ جس کے بعد میدان جنگ کا ملاحظہ کئے بغیر شاہ اور بڑے بڑے سردار اپنے خیموں میں چلے گئے۔

## وشواش راؤ کی لاش پر تنازعہ

اگلے روز صبح وشواش راؤ کی لاش نواب شجاع الدولہ کے پاس لائے۔ اس نے اس کو نہایت احترام سے رکھا اور لاش لانے والوں کو دو ہزار روپیہ انعام دیا۔ ابراہیم خاں گاردی بھی گرفتاروں میں آیا۔ اگرچہ وہ سخت زخمی تھا نواب نے حکم دیا کہ اس کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھ کر اس کی مرہم پٹی پوری توجہ اور احتیاط سے کی جائے۔ اگلے روز احمد شاہ ابدالی نے وشواش راؤ کی لاش ملاحظہ کے لئے طلب کی۔ تمام سالار شاہ کے گرد حلقہ باندھے کھڑے تھے اور سب نے وشواش راؤ کے حسن و جمال کی تعریف کی۔ موت کے واقعہ ہونے سے بھی اس کے حسن میں فرق نہ آیا تھا بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ سویا ہوا اور آرام کر رہا ہے اس کی گردن کی پشت پر تلوار کا ایک زخم تھا اور بائیں آنکھ پر تیر کا ایک ہلکا سا زخم تھا لیکن باقی جسم پر خون بہنے کا نشان نہ تھا۔

وشواش راؤ کی لاش برخوردار خان کے دیوان موتی لال کھتری کے سپرد کی گئی تاکہ اس کو خشک کر کے کابل لے جایا جائے۔ اس پر نواب شجاع الدولہ نے شاہ ابدالی کی خدمت میں عرض کیا ہندوستانیوں کی رسم کے مطابق فتح کے بعد دشمن فوج کے سرداروں کی لاش واپس دے دی جاتی ہے تاکہ وہ مروجہ رسوم کے مطابق ان کو ٹھکانے لگایا جائے۔ اور یہی طریق فاتحوں کے لئے معزز سمجھا جاتا۔ وشواش راؤ کی لاش کو مرہٹوں کے سپرد کر دینے کی بابت دو دن تک بحث ہوتی رہی۔ تمام ہندوستانی سردار اس کے حق میں تھے لیکن درانی افسر لاش کو ساتھ کابل لے جانا چاہتے تھے۔ مجھے (کاشی راؤ) اور نجیب الدولہ کے وکیل میگھ راج کو بھی برخوردار خاں

دیوان موتی لال کے پاس لے جایا گیا۔ مجھے ایک اندرونی خیمہ میں سے
ئے جہاں بھاؤ کا وکیل راجا بابو پنڈت زخمی حالت میں موجود تھا۔ میں نے
ں سے مختصر گفتگو کی۔ اس کے بعد میں ایک اور خیمہ میں گیا جہاں راؤ جنکوجی
ندھیا بیٹھا تھا۔ جنکوجی کی عمر بیس سال تھی اور بازو کو نیزے کے زخم
، وجہ سے باندھے ہوئے تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنا سر نیچے کو جھکا
یا۔ میں نے اسے مخاطب ہو کر کہا "آپ نے میدان جنگ میں ہر ممکن بہادری
اظہار کیا ہے اس لئے شرمندگی کی کوئی وجہ نہیں۔ اس جنگ کے
ادرانہ کارنامے رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے۔" اس پر اس نوجوان نے
ر اوپر اٹھایا اور کہا۔ "تم سچ کہتے ہو۔ تقدیر سے کوئی جنگ نہیں کر سکتا۔
لن میری خواہش ہے کہ میں میدان جنگ میں مارا جاتا۔ لیکن میری قسمت میں
اں لایا جانا لکھا تھا۔ اب یہ لوگ کثیر زر فدیہ طلب کرتے ہیں۔ مطلوبہ رقم
ادا کرنا ممکن ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس وقت اور یہاں روپیہ فراہم نہیں
سکتا۔ ہمارے اور نواب شجاع الدولہ کے خاندان میں ہمیشہ سے اچھے
تعلقات چلے آتے ہیں۔ اگر وہ زر فدیہ ادا کر دیں تو میں اس احسان کو کبھی فراموش
کروں گا" دیوان موتی لال نے بتایا کہ وہ سات لاکھ روپیہ طلب کرتے
، لیکن ممکن ہے کہ وہ [illegible] پر بھی رضا مند ہو جائیں۔ میں فوراً نواب
جاع الدولہ کے خیمہ میں واپس آیا جہاں وہ نجیب الدولہ کے ساتھ بیٹھا
ا تھا۔ چونکہ نجیب الدولہ کو جنکوجی سندھیا سے جانی دشمنی تھی میں نے
رفدیہ کی بابت تذکرہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوسرے خیمہ میں چلا گیا۔
یکن نجیب الدولہ نے نواب شجاع الدولہ کو کہا۔ کاشی رائے کے چہرہ سے
ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے جس میں میری موجودگی مانع ہے۔
شجاع الدولہ نے جواب میں کہا کہ ہمارے درمیان کوئی بات پوشیدہ نہیں
، کہہ کر اس نے مجھے بلایا اور گنگا کی قسم دے کر کہا کہ ہر وہ بات کہہ دو جو
م نجیب الدولہ کی غیر حاضری میں کرنا چاہتے تھے۔ مجبور ہو کر میں نے اصلی معاملہ پیش
ردیا۔ نجیب الدولہ جو نہایت دانا اور عاقل تھا کہنے لگا کہ واقعی بڑے
نسانوں کے لئے مناسب ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کی ایسی حالت میں مدد کریں
س نے وعدہ کیا کہ زر فدیہ میں سے نصف وہ خود ادا کرے گا۔

نواب شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ شاہ ابدالی کی خدمت میں حاضر ہوئے
اور اپنا مقصد بیان کیا۔ شاہ نے برخوردار خاں کو طلب کر کے جنکوجی سندھیا
کو چھپائے رکھنے کی بابت دریافت کیا لیکن اس نے صاف انکار کیا۔ اس پر
شاہ نے برخوردار خاں کے کیمپ کی تلاشی کا حکم صادر کیا۔ برخوردار خان نے اپنے
ملازموں کو خفیہ حکم بھیج دیا کہ شاہ کے آدمیوں کے پہنچنے سے قبل دو نوں قیدیوں
کو قتل کر کے زمین میں دفن کر دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

## ابراہیم خاں گاردی کا حشر

ابراہیم خاں گاردی نواب شجاع الدولہ کے پاس تھا۔ شاہ ابدالی کو
علم ہوا تو اس نے نواب کو طلب کیا۔ اول اول تو اس نے صاف انکار کیا
لیکن شاہ کے مجبور کرنے پر اس نے اقرار کیا کہ ابراہیم خاں گاردی اس کے
پاس ہے۔ شاہ کے آدمیوں نے بہت واویلا کیا کہ ابراہیم خاں گاردی ہمارا سب سے
بڑا دشمن ہے اسے ہمارے سپرد کیا جائے یا ہمیں حکم دیا جائے کہ اس کو پناہ دینے
والے پر حملہ کریں۔ شاہ ولی خان نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے
نواب شجاع الدولہ کو کہا کہ قیدی کو اس کے حوالہ کر دے لیکن وہ متامل تھا۔
وزیر اعظم نے قرآن ہاتھ میں لے کر حلف اٹھایا کہ قیدی کو کسی قسم کا نقصان
نہ پہنچایا جائے گا۔ نیز یہ کہ اسے ایک ہفتہ کے بعد نواب کے کیمپ میں واپس
کر دیا جائے گا۔ احمد شاہ ابدالی نے ابراہیم خان گاردی کو اپنے روبرو طلب کیا
اور طعن آمیز لہجہ میں اسے کہا "آخر تمہارے جیسے بہادر آدمی کی یہ حالت کیوں
ہو گئی ہے؟" ابراہیم خان گاردی نے جواب دیا "کوئی شخص تقدیر کا مقابلہ
نہیں کر سکتا۔ میرا آقا قتل ہو چکا ہے اور میں خود زخمی ہوں" اس نے یہ بھی کہا کہ
اگر وہ بچ جائے اور شاہ اس کو اپنی ملازمت میں لے لے تو وہ اس کی
خدمت میں اسی طرح وفاداری کا اظہار کرے گا جس کا کہ اس نے بھاؤ کے
ساتھ اظہار کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ بعد میں ابدالیوں نے اس کے ساتھ
نہایت بے رحمی کا سلوک کیا۔ اور اس کے زخموں پر زہر چھڑکا گیا جس سے
وہ ساتویں روز جاں بحق ہو گیا۔

## بھاؤ کی تلاش

لڑائی کے دوسرے دن شاہ ابدالی نے لباس فاخرہ زیب تن کیا اور

# انسان کیونکر تندرست رہ سکتا ہے

(حکیم شاہ محمد خاں صاحب - زبدۃ الحکماء)

تندرستی و صحت کا قائم رکھنا ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ صحت سے مراد جسم کی وہ حالت ہے کہ تمام اعضاء اپنا اپنا کام بخوبی کر رہے ہوں اور اس کی نشانی یہ ہے کہ انسان اپنے روزمرہ کے کاموں کو بخوشی ادا کرے اور زندگی میں ایک لطف سا محسوس کرے۔

عمدہ صحت کا نتیجہ عام طور پر لمبی عمر ہوتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر لمبی عمر والا شخص عمر بھر دوسروں کی نسبت تندرست رہا ہو۔ لمبی عمر کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنی زندگی کا کوئی مقصد قرار دے خواہ وہ بچوں کی پرورش، کتاب کی تصنیف، یا حصول جائداد کی شکل میں ہو۔ کیونکہ وہ شخص جس کے سامنے کوئی خاص مقصد نہ ہو کبھی لمبی عمر نہیں پاتا۔ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ مذہبی طرز کی زندگی بسر کرنے والے لوگ عام طور پر طویل العمر ہوتے ہیں۔

ہر شخص عمدہ صحت کا خواہشمند نظر آتا ہے۔ تندرستی دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر شے ہے باوجود اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ صحت قائم رکھنے کے اصولوں کی طرف سے انتہائی لاپروائی برتتے ہیں۔ جو کچھ اوپر مذکور ہوا اس سے ظاہر ہے کہ جسم کا موٹا ہونا صحت کی نشانی نہیں بلکہ ذہنی کیفیتوں کو اس میں بہت دخل ہے۔ ذہنی کیفیت اور تندرستی ایک دوسرے پر منحصر ہیں اور ایک کا اثر دوسرے پر ہونا یقینی ہے۔

صحت اور تندرستی کے خواہشمندوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ تندرستی بہت قیمتی شے ہے لیکن اس کو مال و دولت سے خریدا نہیں جا سکتا۔ اور نہ ہی صحت دوا خانوں اور شفا خانوں میں پائی جاتی ہے۔ صحت بیحد قیمتی ہے لیکن چند نہایت سادہ اصولوں پر عمل کرنے میں مضمر ہے

## تازہ ہوا

صاف اور تازہ ہوا زندگی کے لئے سب سے ضروری چیز ہے یہی وجہ ہے کہ قدرت نے اس کو اس قدر کثیر مقدار میں پیدا کیا ہے۔ پس وہ لوگ جو کھلی ہوا کو چھوڑ کر تنگ و تاریک مکانات میں رہتے ہیں وہ صحت و تندرستی کے ناقدردان نہیں بلکہ دشمن ہیں۔ خوراک کے بغیر انسان کئی مہینے رہ سکتا ہے اور پانی کے بغیر بھی دو ایک روز گزارہ ہو سکتا ہے لیکن تازہ ہوا کے بغیر انسان ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ پس تندرستی کے خواہشمند ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ تازہ ہوا کی اہمیت کو اچھی طرح ذہن نشین کرے۔ اور تنگ و تاریک مکان میں جہاں ہوا اور روشنی کا گزر نہ ہو کبھی نہ رہے اور اگر کوئی شخص ایسا مکان تیار کرا رہا ہو تو اسے اس کی مضرت سے آگاہ کرے۔

تازہ ہوا سے مزید فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کھلے میدان میں کھڑے ہو کر لمبے اور گہرے سانس لیئے جائیں۔ اس سے پھیپھڑے مضبوط ہوتے اور جسمانی اور دماغی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ تازہ ہوا کی خاطر یہ بھی ضروری ہے رہائشی کمرہ کے دروازے اور کھڑکیاں ہر وقت کھلی رہیں حتیٰ کہ رات کو سوتے وقت بھی کسی نہ کسی دروازہ اور کھڑکی کو کھلا رکھنا ضروری ہے۔

بہت لوگ ہیں جو یہ نہیں جانتے کہ جلد کے راستہ بھی ہوا جسم میں داخل یا خارج ہو سکتی ہے پس تنگ اور چست لباس

نہیں پہننا چاہیئے کیونکہ اس سے جلد کو ہوا کے جذب کرنے میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ اسی بنا پر اوپر تلے بہت سے کپڑے بھی نہ پہننا چاہیئے۔

## سورج کی روشنی

تازہ ہوا کے بعد سورج کی روشنی صحت کے لیئے بہت ضروری ہے۔ اس سے کئی امراض دور ہوتے اور جسم کی طاقت و توانائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ تاریک مکانوں میں رہنے والے یہ نہیں محسوس کرتے کہ وہ خدا کی بنائی ہوئی ایک نہایت قیمتی چیز سے اپنے آپ کو محروم کرتے ہیں۔ تاریک مکانوں میں رہنے سے انسان کئی ایک امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ تپ دق کے اکثر مریض وہی ہوتے ہیں جو تنگ و تاریک مکانوں میں بود و باش رکھتے ہیں۔ کھلی ہوا اور جنگلوں میں رہنے والا کوئی شخص تپ دق میں مبتلا نظر نہ آئے گا۔

پس سورج کی روشنی کی اہمیت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کچھ عرصہ سے تو سورج کی شعاعوں کے ذریعہ مختلف امراض کا علاج بھی کیا جانے لگا ہے۔ لہذا گھروں میں دفتروں اور کارخانوں میں غرضیکہ ہر جگہ اور ہر کام میں تازہ ہوا اور سورج کی روشنی کی آمد کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ سورج کی روشنی جسمانی نشو و نما اور طاقت کو قائم رکھنے کے لیئے ہی ضروری نہیں بلکہ یہ ایک ڈاکٹر بھی ہے جس سے کئی امراض شفا پاتے ہیں۔

## صاف پانی

ہوا اور سورج کی روشنی کے بعد پانی کا نمبر آتا ہے صبح کے وقت ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پینا جسم اور اعصاب کو طاقت بخشتا ہے لیکن جن کو قبض کی شکایت رہتی ہو وہ پانی کو ذرا سا گرم کر کے پئیں تو معدہ اور انتڑیوں کی صفائی میں آسانی رہتی ہے۔ کھانے کے دوران میں پانی پینا عام حالتوں میں نقصان نہیں کرتا لیکن بہتر یہی ہے کہ اس دوران میں پانی نہ پیا جائے۔ خاص طور پر کمزور معدہ والوں کو اس ہدایت پر عمل کرنا ضروری ہے۔

## خوراک

بعض لوگوں کا قول ہے کہ انسان مرتا نہیں بلکہ زیادہ یا نامناسب غذائیں کھا کر اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے۔ فارسی کا مشہور شعر ہے ؎

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است

تو معتقد کہ زیستن برائے خوردن است

بہت لوگ ہیں جو اپنی زندگی کا مقصد سوائے کھانے کے اور کچھ نہیں رکھتے۔ حالانکہ غذا کا مقصد ایسی چیزوں کا کھانا ہے جن سے جسم کی نشو و نما ہو اور مختلف اعضا اپنے افعال کو بخوبی سرانجام دیتے رہیں۔ اس کے علاوہ کام کرنے سے جسم کے اندر جو شکست و ریخت ہوتی رہتی ہے۔ اس کا ازالہ ہو سکے۔

کھانا کھانے کے متعلق ہدایات آسان اور سادہ ہیں مثلاً سب سے اول یہ ہے کہ بھوک لگے تو کھاؤ ورنہ بیماری کو مول لینا ہے۔ اگر کھانے کے اوقات مقرر ہوں تو وقت پر خود بخود بھوک محسوس ہوتی ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے رہنا معدہ پر ظلم اور اپنے آپ سے غلط فہمی کرنا ہے۔ ممکن ہے جوانی کے ایام میں بے قاعدگیوں سے تکلیف نہ ہو لیکن عمر کے آخری حصہ میں جوانی کی ان بے قاعدگیوں کا اثر محسوس ہونا ضروری ہے۔

تہذیب و ترقی کے ساتھ انسان نے بدقسمتی سے کھانے میں بہت سے غیر ضروری تکلفات کو شامل کر لیا ہے۔ اور فائدہ کی بجائے ذائقہ اور چاشنی کو مقدم سمجھا جانے لگا ہے۔ لہذا جہاں تک ہو سکے مرچ اور مصالحہ دار چیزوں سے پرہیز کیا جائے۔ آجکل بدقسمتی سے باریک میدہ جیسے آٹے کو پسند کیا جاتا ہے حالانکہ یہ صحت کے لئے بید مضر ہے قبض کی شکایت عام طور پر باریک آٹے سے ہوتی ہے قبض سے بچنے کے لیئے ضروری ہے کہ آٹا موٹا اور چھان ملا ہوا ہو۔ اسی طرح دالوں کو بھی مع چھلکا کے پکانا چاہیئے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ غذا جس قدر سادہ ہو گی اسی نسبت سے بیماریاں جسم سے دور رہیں گی۔ یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ غذا کو آہستہ آہستہ اور چبا کر کھایا جائے کیونکہ ہضم کا عمل منہ کے اندر ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جلدی جلدی اور بغیر چبائے کھانا نگل لینے سے معدہ پر ناجائز بوجھ پڑتا ہے اور اکثر نتیجہ بیماری کی صورت میں بھی رونما ہوتا ہے۔ غم فکر اور پریشانی سے خون کا غلبہ دماغ کی طرف ہوتا ہے اس لئے اس حالت میں جو چیز کھائی جائے وہ اچھی طرح سے ہضم نہیں ہوتی جس کا نتیجہ کئی بیماریاں ہوتی ہیں اس لئے پریشانی کی حالت میں کھانا کھانے سے پرہیز کرنا لازمی ہے۔

# یہ عالم ہے بیداری کا

(جناب سید مظفر حسین صاحب شمیم)

جنگل کی ہوائیں جاگ اُٹھیں مستانہ گھٹائیں جاگ اُٹھیں
فطرت کی ادائیں جاگ اُٹھیں قدرت کی صدائیں جاگ اُٹھیں

بیدار ہے قدرت کا مالی بیدار ہے روحِ بیداری
جس سمت نظر اُٹھتی ہے اُدھر ہے فیض کا اک چشمہ جاری

اے ہندی غافل ہوش میں آ۔ یہ عالم ہے بیداری کا

جمنا کے کنارے جاگ اُٹھے گنگا کے نظّارے جاگ اُٹھے
سب جنگل جل تھل جاگ اُٹھے اور چاند ستارے جاگ اُٹھے

تو کشتی قوم کا مانجھی ہے اِ منجدھار سے بیڑا پار لگا
گر دل میں درد ہے دیس کا تو بھارت کی نیّا پار لگا

اے ہندی غافل ہوش میں آ۔ یہ عالم ہے بیداری کا

# علمبردار حریت مصطفیٰ کامل

(مولانا عبد السبحان ہاشمی ندوی)

جس زمانہ میں مصر اندرونی خانہ جنگیوں اور اغیار کی ریشہ دوانی کی وجہ سے اپنی آزادی سے محروم کیا جا رہا تھا عین اس وقت رحمت ایزدی جوش میں آئی اور مصر کے عروج و اقبال کے اسباب مہیا کرنے لگی۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی ایک نوجوان کی شخصیت تھی جسے دنیا ہمیشہ مصر کی سیاسی تاریخ بطل حریت مصطفیٰ کامل کے نام سے یاد کرے گی۔

مصطفیٰ کامل کی پیدائش ۱۴۔ اگست ۱۸۷۴ء کو شہر قاہرہ کے محلہ حارۃ المیضاء میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام علی آفندی تھا۔ قدرت نے والدین کی آغوش تربیت کو بہترین رہنما اور معلم ثابت کیا جس سے مصطفیٰ کامل نے وطن پرستی اور قومی فداکاری کا سبق سیکھا۔ چار سال کی عمر میں ان کی بسم اللہ خوانی شروع ہوئی اور چھ سال تک خانگی تعلیم پانے کے بعد مدرسہ والدہ عباس میں داخل کئے گئے بارھویں سال ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور وہ یتیم ہو گئے۔

مصطفیٰ کامل کو خداداد ذہانت و فراست ملی تھی ایام تعلیم ہی میں ملکی ضرورتوں کا احساس ہوا چنانچہ سولہ سال کی عمر میں جب کہ وہ مدرسہ خدیوی کے طالب علم تھے اوائل ۱۸۹۰ء میں وزیر تعلیم علی مبارک پاشا کے پاس کسی ضرورت سے آئے۔ اس وقت مجلس گرم تھی اور علی مبارک پاشا ادبار و فضلاء کے حلقہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عین اس حالت میں مصطفیٰ کامل مجلس میں داخل ہوئے اور دلیرانہ لہجہ میں علی مبارک پاشا کو مخاطب کر کے کہا :-

"میں آپ سے وہی حق طلب کرتا ہوں کہ اگر آپ متعلم ہوتے تو آپ بھی اس حق کو ضرور مانگتے، پھر کیا آپ کا گمان ہے کہ کل میں آپ سے زیادہ اپنے ملک و وطن کی خدمت کے قابل نہ ہوں گا۔"

یہ جملہ تھا اور نہایت غیظ و غضب کے ساتھ بلا اجازت طلب کئے ہوئے چل دیئے

## سیاسی زندگی

بیس سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے عملی سیاسی زندگی شروع کی۔ سب سے پہلے انہوں نے آزادی مصر کے مسئلہ کو اٹھایا اور اس سلسلہ میں انہوں نے جس عدیم النظیر فراست سے کام لیا وہ تاریخ میں ہمیشہ سنہری حرفوں سے لکھی جائے گی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مصطفیٰ کامل نے آزادی مصر کے لئے ایک کارٹون تیار کیا جس میں ایک ایوان پارلیمنٹ تھا۔ جس میں ایک تخت بچھا تھا اور اس پر ایک حسین ملکہ پرتکلف لباس پہنے ہوئے بیٹھی تھی اس سے مراد جمہوریت فرانس تھی۔ ملکہ کے بائیں جانب چار عورتیں عمدہ لباس پہنے ہوئے کھڑی تھیں اور مسرت و شادمانی سے اپنے اپنے قومی پھریرے اڑا رہی تھیں یہ اشارہ تھا ولایت متحدہ، یونان، بلجیم اور اٹلی کی طرف جو فرانس کی امداد سے آزاد ہوئیں نیچے کے حصہ میں بائیں جانب مصر کو ایک بدنصیب عورت کی عبرتناک تصویر میں دکھایا تھا جس کے بال بکھرے تھے اور لباس نوچ کر نصف بالائی حصہ جسم کو برہنہ کر دیا گیا تھا۔ اس مظلومہ کی نازک کلائیوں میں ہتھکڑیاں پڑی تھیں اور ان کی زنجیر کا دوسرا سرا ایک خونخوار شیر کے پنجہ میں تھا۔ اس شیر کے پاس جلاد تلوار لئے کھڑا تھا اور اس آفت رسیدہ عورت کی طرف غضبناک ہو کر دیکھ رہا تھا اس سے مراد وہ طاقت تھی جو مصر پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ دائیں جانب اسی کے متصل نیچے کے حصہ میں دریائے نیل کو ایک پیر ضعیف کی شکل میں دکھایا تھا جو ایک ہاتھ سے

اپنے پیالہ پر تکیہ لگائے ہوئے تھا اور دوسرا ہاتھ مہیب جلاد کے اس پاؤں پر تھا جو دریائے نیل میں جا رہا تھا۔ اس سے یہ سمجھانا مقصود تھا کہ یہ شخص اب نیل پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ جسین ملکہ کے سامنے خود مصطفےٰ کامل کھڑے تھے جن کے ہاتھ میں عرضداشت تھی اور پیچھے مصری قوم تھی جس کے ہاتھوں میں اس کا قومی جھنڈا تھا تمام تصویروں کے پیچھے عین وسط میں ہلالی نشان تھا جس کے دائیں جانب تین عربی اشعار تھے اور بائیں جانب ان کا فرانسیسی ترجمہ تھا۔

۱) اے فرانس جس نے ان قوموں کی مصیبت کو دور کیا ہے
جو آج تیرے ذکر سے وجد میں آتی ہیں۔

۲) مصر کی خستہ حالی کو دیکھ اور اسے ہلاکت کے گڑھے سے نکال

۳) دنیا میں حقائق و انصاف کو پھیلا تاکہ وہ قوم جو تجھ سے
محبت کرتی ہے وہ بھی خیر و برکت کی مالک ہو۔

اس کارٹون کے ساتھ مصطفےٰ کامل نے ایک خط بھی جمہوریت فرانس کے صدر کے نام لکھا تھا۔ اس کارٹون کی کئی ہزار کاپیاں طیار کرائیں اور ان کو تمام ممبران پارلیمنٹ، اخباروں کے ایڈیٹر اور فرانس کے مشہور ارباب سیاست کے پاس بھیجا۔ اس کارٹون سے ایک ہلچل پیدا ہو گئی اکثر اخباروں نے اس کارٹون کو نقل کیا اور مصطفےٰ کامل کی اس عدیم النظیر فراست و ذہانت کی داد دی۔ اس خط کی اشاعت کے بعد فرانس نے مصطفےٰ کامل کو ایک خاص جلسہ میں مدعو کیا جہاں انہوں نے آزادیٔ مصر اور دوسرے سیاسی مباحث پر پُر مغز تقریریں کیں۔

## جذبۂ وطن پرستی

مصطفےٰ کامل میں جذبہ وطن پرستی کوٹ کوٹ بھرا تھا وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ دریائے نیل سے اجنبی سیراب ہوں اور خود فرزندان وطن اس کی نعمتوں سے محروم رہیں اس لیئے انہوں نے کوئی تقریر اور تحریر نہیں لکھی جس میں حریت مصر پر زور نہ دیا ہو۔ ایسے وقت میں جب کہ کوئی لیڈر وطنی تحریک لے کر اُٹھے اس کے لیئے ضروری ہے کہ اپنی آواز کو عوام تک پہنچائے اور اس کا بہترین طریقہ اخبارات و رسائل ہیں چنانچہ مصطفےٰ نے اسی کو مدنظر رکھ کر ۱۹[illegible]ء سے ایک پرچہ "اللواء" کے نام سے نکالا یہ پرچہ پہلے روزانہ تھا پھر ماہوار بھی ہو گیا۔

جب انہوں نے یورپ کا سفر کیا تو ان کو بہت سی ضروری باتیں معلوم ہوئیں انہوں نے دیکھا کہ یورپ کے اخبار بسا اوقات ضروری خبروں کو یا تو ایک دم ہضم ہی کر جاتے ہیں یا بالکل غلط چھاپ دیتے ہیں۔ جب وہ اس سفر سے واپس آئے تو ان کا ارادہ ہوا کہ ایک ایسا اخبار نکالا جائے جو مصر کی صحیح آواز کو یورپ تک پہنچائے چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں ایک کمپنی قائم کی جس کا راس المال بیس ہزار پونڈ قرار پایا۔ چند ہی روز میں مصری نوجوانوں نے تمام حصص خرید لیئے اور مطلوبہ رقم جمع کر دی۔ مگر افسوس ان کی زندگی میں یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔

مصطفےٰ کامل سیاسی اصطلاح میں انتہا پسند تھے اور "اللواء" بھی اسی خصوصیت کا حامل تھا انہوں نے ہر اجتماع اور ہر تحریر میں وطن پرستی کی تعلیم دی اور اپنی سوئی قوم کو جگایا ہے۔ ان کے جذبہ وطن پرستی کے متعلق چند جملے ملاحظہ ہوں:-

> "جس قوم میں وطن پرستی کی روح پیدا ہو گئی ہے اور جس قوم کے سینے آزادی کی امنگوں سے لبریز ہیں وہ کبھی نہ مرے گی۔ جو لوگ وطن پرستی کے نشہ میں سرشار ہیں ان کے سروں پر کیسی ہی سیاست کی بجلیاں گرائی جائیں۔ ان کا قدم منزل مقصود سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔"

> کیا مصر برطانیہ سے حسن و جمال اور جاہ و جلال میں کم ہے؟ کہ مصری اس کے ساتھ محبت کرنی چھوڑ دیں اور انگریزوں کو اس امر کا حق حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہیں اپنے ملک کو پیار کریں؟ ہرگز نہیں قسم خدا کی ہرگز نہیں، مصر تو اس لائق ہے کہ ہم اس کی محبت میں اپنی تمام طاقت

اپنے تمام جذبات، اپنے تمام حواس، اپنی ساری جان اور اپنی کل زندگی قربان کر دیں۔"

"اے جذبات وطن سے محروم انسانو! تم کو اپنی بدقسمتی پر رونا چاہیئے اور اپنی زندگی کے بیکار و بے ثمر ہونے پر خون کے آنسو بہانا چاہیئے۔ یقین کرو کہ ہم اس مصیبت و تکلیف کے عالم میں بھی تم سے بہت زیادہ خوش نصیب ہیں، اگر تم دنیا کے عیش میں بدمست ہو اور دولت کے مارے لدے ہو۔ مگر ہمارے دل محبت وطن سے معمور ہیں اور یہ نہایت افضل زندگی، نہایت سچی کامیابی، بہت بڑی سعادت اور کامل فضیلت ہے۔"

"زندگی حباب برآب ہے اگر حب الوطنی سے خالی ہو تو بے روح ہے اور اگر آزادی کا عشق نہ ہو تو عبث ہے در حقیقت زندگی وہی ہے جو اس کی آزادی میں بسر ہو جو قوم عرصہ تک غلام رہتی ہے، شرافت سے محروم ہو جاتی ہے، دل مر جاتا ہے اور انسانیت کی خوبو اس سے نکل جاتی ہے، آزادی قلب میں ہمت، نفس میں شرافت اور عمل میں بلندی پیدا کرتی ہے اور زندگی کو ایسا خوشگوار بنا دیتی ہے کہ مفلس بھی دولتمند کی طرح اپنے کو خوش نصیب سمجھتے ہیں۔"

## حزب الوطنی

مصطفٰے نے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی جس کا نام حزب الوطنی تھا اس کا مقصد اعظم تحفظ وطن اور مصر کی آزادی تھی۔ اہل وطن نے حکومت نے اس انجمن کی پُرزور مخالفت کی جس کی وجہ سے ابتدا میں ایک شخص بھی حزب الوطنی کا معاون و مددگار تمام مصر میں نہ ملا۔ آخرکار کچھ دنوں کے بعد اس پر خلوص آواز کا اثر ہوا اور سب سے پہلے جس نے خدمت وطن کی آواز پر لبیک کہا وہ فرید پاشا وزیر قرضہ مصر کا نوجوان بیٹا تھا جو مصطفٰے کامل سے سات سال بڑا تھا۔ فرید بک کے بعد حزب الوطنی کو بہت فروغ ہوا یہاں تک کہ جوق در جوق لوگ حزب الوطنی میں داخل ہونے لگے۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۰۷ء کو قاہرہ میں ایک عظیم الشان اجتماع ہوا اور اس میں حزب الوطنی کا نظام مرتب کیا گیا اس جلسہ میں مصطفٰے کامل نے حزب الوطنی کے مقاصد کے متعلق ایک فصیح و بلیغ تقریر کی مگر افسوس کہ اس کے دو ماہ بعد ہی حزب الوطنی کا بانی ہمیشہ کے لیئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

چونکہ حزب الوطنی کی بنیاد خلوص کے ساتھ رکھی گئی تھی اس لیئے مرحوم کے بعد اس کو روز بروز فروغ ہوتا رہا۔ مرحوم کے انتقال کے دوسرے ہی دن ارکان حزب الوطنی کی ایک جماعت نے مجلس انتظامیہ کو طلب کیا۔ شام کو مجلس انتظامیہ کا اجلاس ہوا اور باتفاق رائے محمد فرید بک صدر منتخب ہوئے۔ اس کے بعد پھر مجلس عام منعقد ہوئی اور محمد فرید بک کی صدارت کا اعلان کیا گیا۔

محمد فرید بک نے صدر ہونے کے بعد وزیر خارجیہ انگلستان کو حسب ذیل خط لکھا :۔

جناب سر ایڈورڈ گرے وزیر خارجیہ انگلستان:

"مجھ کو مجلس عام نے حزب الوطنی کا صدر مرحوم مصطفٰے کامل پاشا کی بجائے منتخب کیا ہے اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ مجلس عام کی طرف سے ناجائز مصر پر قبضہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر دوں۔ یہ مجلس اعلان کرتی ہے کہ وہ مرحوم مصطفٰے کامل پاشا کے نقش قدم پر چلے گی حتٰی کہ انگلستان اپنے وعدوں کو پورا کرے۔"

مصطفٰے کامل نے ایک سوشیل کانفرنس (تربیتی کانفرنس) بھی قائم کرنے کا قصد کیا تھا مگر یہ آرزو دل کی دل ہی میں رہ گئی اور مصطفٰے کامل چلتی پھرتی دنیا کو چھوڑ کر چل بسے۔

## طلبہ پر خاص نظر

علم فی نفسہٖ ایک روشنی ہے جس سے انسانی طبیعتوں میں جلا پیدا ہوتی ہے مگر غلام قوم کو جو تعلیم دی جاتی ہے وہ روشنی کے عوض تاریکی پیدا کرتی ہے۔ غلام قوم کو کبھی زندہ دلی

علو ہمتی شرافت نفسی وطن پرستی قومیت پرستی باہمی یگانگت اور حریت حقہ کی تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ اس کو جو کچھ سکھایا جاتا ہے صرف یہ سکھایا جاتا ہے کہ وہ ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے اجنبی آقاؤں کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ حکمران جماعت کی طرف سے عملاً قوم کے ذہن میں ہمیشہ یہ بات ڈالی جا رہی ہے کہ ملک و وطن کے لیے آواز اٹھانا اور آواز اٹھانے والوں کا ساتھ دینا ان کی نافرمانی ہے اور یہ بدترین جرم ہے۔ انہیں نقائص کو مد نظر رکھ کر مصطفےٰ کامل نے ایک ایسا مدرسہ قائم کرنا چاہا تھا جہاں حکومت کا اثر نہ ہو بلکہ تعلیم آزاد ہو اور طلبہ کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے وہ اجنبی حکومتوں کے پاؤں مضبوط کرنے کے عوض اپنے ملک و وطن کی صحیح خدمت کریں۔ ۴ر مارچ ۱۸۹۹ء کو اس درسگاہ کا افتتاح ہوا اور اس کا نام "مدرسہ مصطفےٰ کامل" تجویز کیا گیا۔ اس مدرسہ کے نصاب میں اخلاق عربیہ۔ عادات وطنیہ اور مذہبی تعلیمات کا زیادہ لحاظ رکھا گیا۔ بانی مدرسہ کے وقت یہ مدرسہ کافی ترقی کر چکا تھا۔

طلبہ ہی کی جماعت ایک ایسی ہے جس کی تربیت جذبات وطن پرستی اور خدمات ملی کے سانچے میں اگر کی جائے تو وہ قوم کے مستقبل کو روشن بنا سکتی ہے یہی وجہ تھی کہ مصطفےٰ کامل ان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کا یہ شعار تھا کہ ہمیشہ تقریر و تحریر میں طلبہ کو خدمات وطن کے لیے [illegible] مگر ساتھ ہی ہمیشہ بلوے یا بغاوت سے نفرت دلاتے تھے۔ ایک مرتبہ قانون کے چند طلبہ نے مجلۃ المجلات کے ایڈیٹر سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ انہیں مصطفےٰ کامل کے سامنے پیش کر دیں اس موقع پر مصطفےٰ کامل نے ان کے سامنے جو تقریر کی اس کا ہر ہر لفظ طلبہ کے لیے قابل غور و عمل ہے آپ نے فرمایا:

"ہم سب خدام وطن ایک سپاہی ہیں اور سپاہی کے لیے ہتھیاروں کی ضرورت ہے۔ پس ہمارا ہتھیار صرف علم ہے تم جاؤ اور کافی سعی کے ساتھ تعلیم حاصل کرو اور اپنی سندیں لے کر نکلو اس کے بعد ہمارے پاس آؤ اور چلو بہ پہلو کھڑے ہو کر ملک و وطن کی خدمت انجام دو۔"

۱۰۔ فروری ۱۹۰۸ء کو تشنج کا دورہ پڑا اس وقت اپنے بھائی علی بک فہمی کو بلا کر یہ وصیت کی۔

"تم کو ایک نڈر بہادر ہونا چاہیے۔ میرے نقش قدم پر چلنا اور میرے کام کو زندہ رکھنا۔ یقین جانو کہ تمہارا بھائی مرا نہیں۔ قوم تمہاری معین و مددگار ہے۔ یاد رکھو یہ خوب یاد رکھو کہ ہم حق و صداقت پر ہیں اور اسی لیے خوار نہیں ہو سکتے۔ ممکن ہے کہ بعض اشخاص میری موت کے بعد تجھے بُرا کہیں۔ لیکن بالآخر وہ بھی ایک دن مر جائیں گے خدا کا شکر ہے کہ میں نے حزب الوطنی کی بنیاد رکھ دی ہے اور ایسے آدمیوں کو چھوڑ رہا ہوں جو اس بنیاد کو بلند کریں گے اور اس پر میری امیدوں کی عمارت تیار کریں گے یہاں تک کہ ہمارے ملک کا تباہ شدہ عروج و اقبال واپس آ جائے۔"

یہ وصیت ختم ہونے ہی چند ہچکیوں کے بعد روح پرواز کر گئی یہ خبر اطراف و جوانب میں پہنچی تو مدارس اور دکانیں بند کر دی گئیں طلبہ اور بالخصوص کالج کے طلبہ پر رنج و غم کا اثر سب سے زیادہ تھا طلبہ نے اپنے قائد اعظم کے ماتم میں ۱۱۔ فروری کا اتوار کا دن بھی ماتم میں گزارا اور مصر کے تمام مدارس بند رہے۔

[illegible] ماتم کیا۔ مرحوم کا جس وقت جنازہ نکلا تین گھنٹے تک قاہرہ کی تمام [illegible] ٹریموے بند رہی اور اس مدت میں کوئی اور سواری بھی نہ گزر سکی۔

جنازہ لے جانے کے وقت طلبہ نے خاص اہتمام کیا تھا۔ مصر کے اور غیر سرکاری ہر مدرسہ کے طلبہ نے اپنے ماتمی جھنڈے جن پر [illegible] میں مرحوم کا نام لکھا اور ارد گرد ماتمی علامات قائم کیں ان جھنڈوں پر یہ کا نام تھا۔ ٹریننگ کالج کا جھنڈا سیاہ تھا جس پر مدرسہ کا نام [illegible] توفیقیہ کا جھنڈا سفید تھا۔ قانونی مدرسہ کا جھنڈا مصر کا قومی جھنڈا تھا سب سے آگے ہی جھنڈا تھا اور اس پر "اللواء" کا نام لکھا تھا۔

# نانی چندو

(جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی بی اے اسسٹنٹ ہوم سکریٹری حیدرآباد دکن)

خدا معلوم یہ ہماری نانی چندو دنیا میں تشریف ہی کیوں لائیں اور اگر لائی بھی تھیں تو نانا صاحب قبلہ کے حصہ میں کیوں آئیں۔ اور اگر آئی بھی تھیں تو ہمارے زمانہ تک یہ کیوں زندہ ہیں۔ دنیا ترقی کر رہی ہے مگر ان کی ہر بات میں تنزل ہے۔ پہلے حور کی صورت تھیں اس کے بعد انسانوں کی شکل ہوئیں۔ اور اب انسان تو کیا شاید کوئی حیوان بھی ان کی صورت کا ہو تو ہو۔ پہلے مہر افروز تھیں۔ اس کے بعد گھٹ کر چاندنی خانم ہوئیں۔ اور اب صرف نانی چندو رہ گئیں۔ اللہ کے بھی کچھ عجب کارخانے ہیں۔ جوان مرے چلے جاتے ہیں اور نہیں مرتیں تو یہ سوا سو برس کی نانی چندو۔ گھر والے دوسروں کے مرنے پر روتے ہیں اور ان کے جینے پر روتے ہیں۔ خود ان کی یہ حالت ہے کہ مرنے کا نام آیا اور یہ رو دیں۔ مطلب یہ ہے کہ باوجود کھنگر ہو جانے کے یہ ابھی اس دنیائے فانی سے تشریف لے جانا پسند نہیں کرتیں۔ بچوں کو ان کی چڑ ہاتھ آگئی ہے۔ ایک آیا اور کان میں کہہ گیا کہ "نانی چندو۔ اب تم کب مرو گی"۔ انھوں نے سنا اور کوسنے دینے شروع کئے۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور انھوں نے کہا "دیکھنا بوا۔ یہ کون دروازہ دھڑادھڑ کر رہا ہے۔ غضب خدا کا ماما ئیں بہری ہوگئی ہیں۔ جواب تک نہیں دیتیں" ان کا اتنا کہنا اور کسی نے آکر چپکے سے کہہ دیا کہ "نانی۔ تمہارے ہی پاس ایک صاحب آئے ہیں" انھوں نے پوچھا "اری میرے پاس کون آنے لگا تو مجھ سے بھی مذاق کرتی ہے" اس نے جواب دیا "نانی میں کوئی جھوٹ تھوڑی بولتی ہوں۔ اللہ میاں نے تمہارے لے جانے کو فرشتے بھیجے ہیں" یہ سننا تھا کہ نانی چندو نے ہزاروں صلواتیں سنانی شروع کردیں۔ غرض گھر میں سارے دن یہی آفت برپا رہتی ہے۔ چھوٹے تو چھوٹے بڑے بھی تو ان کے ستانے میں کسر نہیں کرتے۔

رضیہ مولوی صاحب کے پاس سے آئی سیدھی نانی چندو کے پاس پہنچی اور کہنے لگی "اجی نانی۔ اجی نانی۔ آج ہم نے بڑے فرسٹ کا سبق پڑھ لیا" انھوں نے کہا "شاباش بیٹا۔ جلدی جلدی پڑھ کر اپنے بھائی سے آگے بڑھ جاؤ۔ ہاں تم نے آج کیا پڑھا" رضیہ نے کہا

الحمد۔ نانی چندو چوہا لٹکے بلی جھپکے

یہ سننا تھا کہ نانی چندو کا پارہ سوا سو ڈگری پر پہنچ گیا۔ اور اس کے بعد جو انھوں نے برا بھلا کہنے کی رٹ لگائی تو جب تک چیختے چیختے گلا ہی خشک ہوگیا اس وقت کہیں جا کر چپکی ہوئیں۔

خیر اب تو یہ نانی چندو ہیں۔ مگر پہلے کی کچھ نہ پوچھو کہ یہ کیا تھیں۔ سارے دلی شہر میں گھر گھر بیٹھنے والیوں کی ناک تھیں۔ شکل و صورت خدا نے وہ دی تھی کہ انسان دیکھے اور غش غش کرے۔ آنکھوں میں وہ جادو بھرا تھا کہ جس کو نظر بھر کر دیکھ لیا وہی ان کا کلمہ پڑھنے لگا۔ بڑے بڑے رئیس اور امیر ان پر لوٹ تھے۔ مگر ان کا وہ رکھ رکھاؤ تھا کہ کسی کو اپنی حد سے بڑھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ گلا اس غضب کا پایا تھا کہ جس نے سنا وہ بے خود ہوگیا۔ علم موسیقی میں ایسا دخل تھا کہ تان سین خاں کان پکڑتے تھے۔ بادشاہ سلامت نے بھی کئی دفعہ کوشش کی کہ یہ قلعہ میں آکر کچھ سنا جائیں۔ مگر ان کا وہ دماغ تھا کہ صاف انکار کر دیا۔ خدا معلوم صحیح ہے یا غلط مگر سنتے تو یہ ہیں کہ بھیس بدل کر خود بادشاہ سلامت ان کا گانا سننے آیا کرتے تھے۔ جب صورت شکل ایسی ہو۔ گلا ایسا ہو۔ آواز ایسی ہو۔ فن ایسا ہو

تو روپے پیسے کی کیا کمی ہو سکتی ہے۔ گھر میں مینہ برستا تھا۔ بڑا زبردست کارخانہ تھا۔ نوکر چاکر۔ مامائیں۔ اصیلیں۔ غرض سینکڑوں آدمی بھرے پڑے تھے۔ اور اب؟

اب کی کچھ نہ پوچھو۔ اب تو ان کو دیکھ کر کوئی کہہ بھی نہیں سکتا کہ یہ وہی ماہ افروز ہیں جن پر ساری دلی جان دیتی تھی۔ کمر جھک کر دوہری کیا تہری ہو گئی ہے۔ چہرے پر جھریاں اس غضب کی پڑی ہیں کہ اف تو کیا ہوا کپڑا بھی کیا ہو گا۔ آنکھیں اندر دھنس کر غائب ہو گئی ہیں۔ پپوٹوں نے لٹک کر آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ دانتوں نے ٹوٹ کر ہمیشہ کے لئے منہ کھول دیا ہے۔ زبان کسی روک نہ ہونے کی وجہ سے اکثر باہر نکلی رہتی ہے۔ جبڑا دب جانے سے ناک جھک کر ہونٹوں پر آ گئی ہے۔ گھٹنے کانوں سے نکل کر سر سے بھی کچھ اوپر نکل گئے ہیں۔ جب یہ بیٹھتی ہیں تو ان کا منہ ٹانگوں کے عین بیچ میں آ جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی کٹھڑی میں سے جھانک رہا ہے۔ اب رہی آواز تو آواز میں گو رس نہیں رہا پھر بھی بلندی وہ ہے کہ کسی جوان آدمی کی بھی کیا ہو گی۔ بیچاری اپنی پہلی حالت کا اکثر ذکر کیا کرتی ہیں کبھی رو دیتی ہیں اور کبھی ہنسنے لگتی ہیں۔ ہمارے ہاں ایک ماما ہے۔ شکل و صورت تو کچھ واجبی واجبی ہے۔ ہاں بال اتنے بڑے ہیں کہ سارے ہندوستان میں کوئی دس پانچ عورتوں ہی کے ہوں تو ہوں۔ بلا مبالغہ ایڑی تک آتے ہیں۔ ایک دن میری چھوٹی بہن بی عزیزہ نے کہا۔ "نانی۔ میرے بال موئے بڑھتے ہی نہیں۔ چقندر کا تیل ڈالا۔ ریٹھوں کی مالش کی۔ دال سے سر دھویا۔ حکیم جی کا بنایا ہوا تیل دونوں سر میں رگڑا۔ لیکن بال بڑھتے تو کہاں۔ اُلٹے اترے چلے جا رہے ہیں۔ کنگھی کرتی ہوں۔ تو لچھے کے لچھے اترتے ہیں۔ اور اس نگوڑی نصیبن کو دیکھو اس کے بال بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ابھی پاؤں تک آتے ہیں آگے چل کر پاؤں میں آئیں گے۔ اور مزا لتی مولی کیا ہے کہ دھوئی تلی کا تیل۔ آخر آپ بھی تو دنیا دیکھے ہوئی ہیں آپ ہی کوئی نسخہ بتایئے" نانی جیندو نے ایک بڑا لمبا ٹھنڈا سانس کھینچا۔ اور کہنے لگیں "بیٹی کیا بتاؤں۔ تم میرے بال دیکھتیں تو حیران رہ جاتیں۔ اے ہے۔ اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ مجھ سے تو کنگھی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ دو دو تین تین مامائیں ہاتھ لگاتیں جب کہیں جا کر دو ڈھائی گھنٹہ میں کنگھی ہوتی"۔ عزیزہ نے کہا "اے ہے۔ نانی۔ اب تو تمہارے سر میں ان بالوں میں کا ایک بال بھی نہیں رہا"۔ بیچاری عزیزہ نے تو بالکل بھولے پن سے یہ بات کہی تھی اور بی نانی جیندو نے اس کو طعنہ سمجھا۔ نسخہ بتانا تو کیسا اس غریب کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ ایسی بُری طرح اس بیچاری کو لیا کہ روانکھی ہو گئی۔ وہاں سے اٹھ کر دالان میں آئی اور اماں جان سے شکایت کرنے لگی۔ مجھ کو نانی جیندو کی یہ بات بُری لگی چپکے سے وہاں سے اٹھ نصیبن جا کر ایک پیسہ دیا۔ اور اس کا ایک بال جڑ سے اکھیڑ کر نانی جیندو کے پاس لے گیا۔ انہوں نے جو میری آہٹ پائی تو بولیں "کون سعید" میں نے کہا "ہاں نانی۔ میں ہوں۔ آپ کے لئے ایک تحفہ لایا ہوں"۔ تحفہ کا نام سنتے ہی بڑی بی کی باچھیں کھل گئیں۔ کہنے لگیں۔ "بیٹا کیا لایا۔ لا مجھے دے۔ کس نے بھیجا ہے"۔ میں نے کہا "آپ کی جو ماما اختری تھی نا۔ اس نے بھیجا ہے"۔ بولیں "ہیں۔ اختری۔ اسے کیا بکتا ہے۔ اختری تو مر کر پچاس برس ہوئے۔ تو بڈھوں سے بھی مذاق کرتا ہے"۔ میں نے کہا "نانی جان۔ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ اختری مر چکی ہے۔ اس نے یہ تحفہ دلی سے تھوڑی بھیجا ہے۔ جنت سے بھیجا ہے اور لکھا ہے کہ آپ کی یہ چیز میرے کفن میں لپٹ کر چلی آئی تھی۔ میں نے سینت کر رکھ لی تھی۔ خیال تھا کہ جب آپ آئیں گی تو دیدوں گی۔ آپ آنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ قیامت قریب آ رہی ہے۔ مجھے ڈر لگا کہ آپ کی چیز اگر آپ کو نہ پہنچ گئی تو حشر میں کیا جواب دوں گی۔ اس لئے بھیجے دیتی ہوں۔ نانی اماں۔ لیجئے یہ اپنی چیز" میرے مسخرے پن کو وہ اچھی طرح سمجھ گئیں مگر "چیز" ایسا لفظ تھا کہ بے اختیار انہوں نے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے نصیبن کا وہ بال ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پہلے تو ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا بلا ہے۔ جب فرہاد دونوں ہاتھوں سے ٹٹول کر

اور کھینچ کر دیکھا تو بال نکلا۔ بڑی بگڑیں۔ میں نے کہا نانی جان آپ خفا کیوں ہوتی ہیں۔ یہ انہیں بالوں میں کا ایک بال ہے جس کی آپ عزیزہ سے اتنی تعریف کر رہی تھیں۔" میں تو یہ کہہ کر باہر نکل آیا۔ اور ان کی جو زبان چلی تو پھر اس وقت جا کر رکی۔ جب کھانا سامنے آیا۔ اور پلاؤ کی خوشبو ناک میں پہنچی۔

ہماری نانی چندہ ندیدی ہیں اور بڑی زوردار ندیدی ہیں۔ اور مجھ سے پوچھو تو دنیا میں کوئی ایسا نہیں جو ندیدہ نہ ہو۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ کسی کے ندیدہ پن کو اس کا جبہ و دستار چھپائے ہے اور کسی کا عزت و وقار۔ برخلاف اس کے کسی کا ندیدہ پن اس کے افلاس کی وجہ سے ظاہر ہو جاتا ہے تو کسی کے لباس سے۔ مگر ہیں سب کے سب ندیدے۔ ندیدہ پن ہے کیا چیز؟ "کسی چیز یا کسی شے کو دیکھنے سے خود بخود اعضا میں ایک خاص قسم کی حرکت یا جوش کا پیدا ہونا کہ اس چیز کو خواہ کسی طرح بھی ہو حاصل کیا جائے۔" بعض لوگوں کے اس خیال کو بوجہ ان کی بزرگی و عظمت کے محسوس نہیں جاتا اور اگر محسوس بھی کیا جاتا ہے تو اس کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ اور بعض لوگوں کے اس خیال کو ان کی کم مائگی و عسرت کے باعث پوری طرح محسوس کیا جاتا ہے اور دل کھول کر اس پر رائے زنی کی جاتی ہے۔ اس کے چرچے ہوتے ہیں۔ قصے بیان کئے جاتے ہیں۔ اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے اس کی تشہیر کی جاتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھو تو دراصل ہیں دونوں کے دونوں ندیدے۔ کیا آپ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا وہ قصہ بھول گئے کہ کسی امیر کے ہاں دعوت تھی۔ شیخ بھی ان دنوں اسی شہر میں آئے ہوئے تھے۔ دعوت کی سن کر پھٹے کپڑوں اور ژولیدہ حال سے دعوت میں پہنچے۔ دسترخوان پر بیٹھے۔ اور بیٹھتے ہی شیرمال گھسیٹی۔ لوگوں نے ندیدہ سمجھ کر کھڑے کھڑے ان کو وہاں سے نکالا مگر شیخ بھی طرفہ معجون تھے۔ سیدھے ایک دوکان پر گئے۔ مولویوں کا سا لباس کرایہ پر لیا۔ اور جون بدل کر پھر اسی دعوت میں آدھمکے۔ لوگوں نے ان کی ظاہری حالت دیکھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انہوں نے دسترخوان پر بیٹھتے ہی شیرمال پر ہاتھ ڈالا۔ میزبان نے نکالنا تو کجا ان کی طرف طرح طرح کے کھانوں کی رکابیاں بڑھانی شروع کیں۔ رکابی آتی یہ اس میں سے بہت سا کھانا نکالتے اور اپنی آستینوں میں بھر لیتے۔ تمام لوگ ان کی اس حرکت سے حیران تھے۔ آخر انہوں ہی نے یہ معمہ خود حل کیا اور کہا دوستو! تم میری دعوت نہیں کر رہے میرے کپڑوں کی دعوت کر رہے ہو۔ اس لئے میں خود کچھ نہیں کھاتا۔ ان کپڑوں ہی کو کھلاتا ہوں۔ میں تو وہی ہوں جس کو ابھی ندیدہ سمجھ کر تم نے دسترخوان سے اٹھا دیا تھا۔" اب آپ ہی بتائیے کہ دونوں قسم کے لباس میں تھے تو شیخ سعدیؒ ہی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ ایک دفعہ ان کو ندیدہ سمجھ کر نکال دیا گیا اور دوسری دفعہ ایسی خاطر تواضع کی گئی۔ بات یہ ہے کہ جو اصول میں نے اوپر بیان کیا ہے وہی یہاں بھی پورا اترا۔ کہ محض لباس اور وضع قطع لوگوں کے خیالات بدل دے تو بدل دے ورنہ ہوتے ہیں سب ندیدے۔ خواہ وہ شاہانہ لباس میں ہوں۔ یا فقیروں کے چیتھڑوں میں۔

اگر آپ اس واقعہ کو محض قصہ سمجھتے ہیں تو خود تجربہ کر لیجے۔ دو شخصوں کو بلوائیے۔ جن میں ایک کو آپ ندیدہ کہتے ہوں اور دوسرے کو سیرچشم۔ دونوں کی دعوت کیجئے۔ لیکن دسترخوان اس وقت تک نہ بچھوائیے جب تک بھوک کے مارے دونوں کی انتڑیاں قل ہو اللہ نہ پڑھنے لگیں۔ اس کے بعد طرح طرح کے خوشبودار کھانے سرپوش سے ڈھکی ہوئی قابوں میں لا کر دسترخوان پر چن دیجئے۔ اور تھوڑی دیر تک ان کو یونہی بند کا بند رہنے دیجئے۔ اس کے بعد اپنے دونوں مہمانوں کے منہ کسی طرح کھلوا کر دیکھئے آپ کو معلوم ہوگا کہ دونوں کے منہ میں پانی بھرا ہوا ہے اور یہی ندیدہ پن کی خاص نشانی ہے یہ دوسری بات ہے کہ ایک صاحب اس پانی کو گھونٹ کر کے نگل جاتے ہیں۔ اور دوسرے کی باچھوں سے یہ پانی بہ نکلتا ہے۔ مگر دراصل ہیں دونو ندیدے۔

خیر۔ یہ تو ندیدہ پن کا فلسفہ اور تجربے ہوئے۔ اب نانی چندو کا ندیدہ پن دیکھئے۔ خدا کی قدرت نظر آتی ہے کہ جس عورت کا دسترخوان

کبھی رئیسوں اور بادشاہوں کا سا دسترخوان ہو۔ جس کو دنیا جہان کی نعمت میسر رہ چکی ہو۔ جس کی تمام عمر اچھی سے اچھی نعمتیں کھا کر گزری ہو۔ وہ اپنی آخر عمر میں ایسی ندیدی ہو جائے کہ گھر میں کسی چیز کا آنا مشکل ہو۔ یہ نہیں تھا کہ گھر میں جو چیز آتی ہو وہ نانی چندو کو نہ ملتی ہو۔ یہ نہیں تھا کہ جو چیز وہ مانگتی ہوں وہ ان کو نہ منگا دی جاتی ہو۔ مگر اس کا کیا علاج کہ اگر ان کو پلاؤ دو تو ان کا جی دال کھانے کو چاہے۔ اور اگر دال دو تو پلاؤ پر ان کی رال ٹپکے۔ پیٹ بھر کر خربوزے کھائیں اور آنکھ بچا کر چھلکے بھی حلق سے اتار لیں۔

زنانہ مکان میں جو صحن چبوترہ ہے اس کی ایک صحنچی ان کو ملی ہوئی تھی۔ صدر کے جو دو دالان ہیں ان میں بی اماں رہتی تھیں بی اماں کیا رہتی تھیں۔ ساری گھرداری اسی میں تھی۔ گھر میں کوئی چیز آئی اور نانی چندو کی ناک میں خوشبو پہنچی۔ خوشبو پہنچی اور انھوں نے کسی چھوکری کو پکارا۔ "اری بنین۔ اری بنیں۔ ذرا ادھر تو آئیو۔" بھلا چھوکریاں بڑی بی کی بات کو کب سننے والی ہیں۔ ایک کان سنا۔ دوسرے کان اڑا دیا۔ مگر بڑی بی کوئی چپ رہنے والی آسامی ہیں۔ کلیجہ پھاڑ پھاڑ کر برابر کسی نہ کسی کو آواز دیئے ہی جاتیں اور آخر کو کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ آ ہی جاتا۔ یہ پوچھتیں "بیٹا۔ دیکھیو آج گھر میں کیا میوہ آیا ہے۔ کیا اچھی خوشبو آ رہی ہے۔ نارنگیاں معلوم ہوتی ہیں۔ ہاں بیٹا۔ ذرا اصغری سے جا کر کہیو کہ دو پھانکیں مجھے بھی بھیج دیں۔ میرا گلا خشک ہو رہا ہے۔ اور دیکھیو اگر تین پھانکیں لائی تو ایک تجھے بھی دوں گی۔" اس بیچاری چھوکری نے آ کر بی اماں سے کہا انہوں نے پوری دو نارنگیاں اٹھا بڑی بی کو بھیج دیں۔ اب ناممکن ہے کہ نانی چندو ایک پھانک تو کجا رتی برابر نارنگی بھی اس لانے والی چھوکری کو دیں۔ خود چھیلیں۔ خود کھائیں۔ اور چھلکے اٹھا صحن میں پھینک دیئے۔ ابھی نارنگیاں کھا کر فراغت کی تھی کہ کوئی بچہ نارنگی کھاتا ہوا ان کی صحنچی کے پاس سے گزرا۔ انہوں نے آواز دی "کون ہے۔ سعید ہے۔" اس بچہ نے کہا "نہیں نانی۔ میں ہوں رشید"

بڑی بی بولیں "بیٹا۔ ذرا یہاں آئیو۔ کیا کھا رہا ہے۔ نارنگی ہو گی میٹھی ہے یا کھٹی۔ بیٹا۔ ایک پھانک ہمیں بھی دے۔ دیکھ اچھے بچے مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔ تنہا خوری اچھی نہیں۔ لا بیٹا لا۔ بھلا میاں رشید کیا پگھلنے والی آسامی ہیں۔ انہوں نے کہا۔ "اے ہے۔ نانی جان ابھی تو دو نارنگیاں کھا چکی ہو۔ مجھے تو بی اماں نے چار ہی پھانکیں دی ہیں۔ ان میں سے بھی حصہ بٹانا چاہتی ہو۔ میں تو نہیں دینا۔ جاؤ بی اماں سے مانگو۔" یہ کہہ۔ میاں رشید تو چلتے ہوئے اور نانی چندو نے لکچر دینا شروع کیا "بس اس گھر کا اللہ ہی مالک ہے بچے ایسے نکلے ہیں کہ نوچ کسی کے ہوں۔ ہر وقت منہ چلتا رہتا ہے۔ اور اس پر نیت کا یہ حال ہے کہ ذرا کچھ مانگو تو سامنے سے ٹل جائیں۔ کیوں نہ ہو بی اصغری کے بچے ہیں۔ ایسے نہ ہوں گے تو کیسے ہوں گے۔ یہ تو وہ ہیں کہ دوسروں کے حلق میں انگلی ڈال کر کھایا پیا سب نکلوا لیں۔ اور کوئی مرتا بھی ہو تو اس کے حلق میں پانی کی بوند نہ ٹپکائیں۔ لاحول ولا قوت۔ میری بھی کیا بری قسمت ہے جو اس گھر میں آ کر پڑی ہوں۔ وہ کیا مرے میری تو مٹی پلید ہو گئی۔" غرض اسی قسم کی باتوں کا تانا بانا یہاں تک بندھا کہ بی اماں کو کچھ بن نہ آئی اور نارنگیوں کی ٹوکری کی ٹوکری بڑی بی کے پاس لا کر رکھ دی۔ کہ لو نگلو۔ اب نانی چندو کی شرافت دیکھئے کہ چپکے سے لے ٹوکری اپنے ٹین کے صندوق میں بند کر دی۔ یہ بھی خیال نہیں کیا کہ بیچارے بچے یونہی منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔

ایک دن کیا ہوا کہ بی اماں ان کے پاس بیٹھی تھیں کہ اتنے میں ابا میاں نے باہر سے خربوزے بھیجے اور کہلا بھیجا کہ ابھی کاٹ کر باہر بھیج دو۔ بی اماں نے رکابیاں اور چھری منگا کر خربوزے کاٹنے شروع کئے۔ نانی چندو کی یہ حالت تھی کہ جہاں کوئی خربوزہ کٹا اور انہوں نے پوچھا "دلھن۔ تم نے چکھا بھی۔ کس مزے کا ہے۔ دیکھنا کہیں کوئی پھیکا خربوزہ باہر نہ بھیج دینا۔ لوگ کہیں گے کہ ان کو خربوزے خریدنے بھی نہیں آتے۔ لاؤ مجھے دو۔ میں چکھوں۔"

بی اماں جو خربوزہ کاٹتیں اس کی ایک پھانک ان کو بھی دیدیتیں۔ دس بارہ خربوزے تھے۔ اتنی پھانکیں کھا کر بڑی بی کا پیٹ بھر گیا ہوگا مگر نیت کا علاج۔ رکابیاں باہر گئیں۔ بی اماں کسی کام سے دالان میں آئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جو جا کر دیکھتی ہیں۔ تو آدھے چھلکے غائب ہیں۔ ادھر دیکھا۔ اُدھر دیکھا۔ جب کہیں نظر نہ آئے تو گلبدن سے بلا کر پوچھا کہ آخر یہاں سے چھلکے کون اٹھا کر لے گیا۔ گلبدن بولی "لے جائے گا کون۔ بڑی بیگم بیٹھی کھا رہی تھیں۔ اور اگر آپ نہ آجاتیں تو تھوڑی دیر میں یہ باقی آدھے چھلکے بھی ختم کئے تھے"۔ یہ سُن کر بی اماں کو بہت غصہ آیا اور کہا "اماں جان۔ یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ خدا کے لئے ایسی باتیں تو نہ کیجئے۔ گھر میں جو چیز آتی ہے وہ پہلے آپ کو ملتی ہے۔ اور ملتی ہے تو سب سے زیادہ۔ آخر اس طرح کی باتوں سے کیا فائدہ۔ گھر کی مامائیں ہنستی ہیں۔ چھوکریاں مذاق اڑاتی ہیں۔ گھر گھر آپ کی یہ باتیں پھیلتی ہیں۔ ہم کو شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ خدا کے لئے جس چیز کو آپ کا جی چاہے وہ منگوا لیا کیجئے۔ اور پیٹ بھر کر کھا لیا کیجئے۔ اور لِللہ یہ چھلکے کھانا تو چھوڑیئے ابھی ان کو معلوم ہو جائے تو دیکھئے کیا غل مچاتے ہیں"۔

اب نانی چندو کا ظلم دیکھو کہ بجائے اس کے کہ شرمندہ ہوتیں۔ الٹی بی اماں کی جان کو آگئیں۔ اپنے کو کوسنے دیئے مرنے والوں کو بُرا بھلا کہا۔ گھر بھر کی نکتہ چینی کی چھلکوں کو گالیاں دیں۔ غرض گھنٹوں یہی باجہ بجتا رہا۔ بی اماں تو گھبرا کر وہاں سے اُٹھ آئیں۔ ہاں نانی چندو کا بُڑبڑانا آدھی رات تک یونہی چلا گیا۔ جب نیند نے ان کی آنکھیں ہی بند کر دیں اس وقت کہیں جا کر امن چین ہوا۔

سعیدہ کی گڑیا کا واقعہ نانی چندو کی سب سے بڑی کارگزاری ہے۔ ہوا یہ کہ سعیدہ اپنی سیلولائڈ کی گڑیا لیکر ان کے پاس پہنچی۔ وہاں تھوڑی دیر تک کھیلتی رہی اور اس کے بعد گڑیا وہیں چھوڑ کر دالان میں چلی آئی۔ نانی چندو نے گڑیا اٹھا کر دیکھا تو بڑی ہلکی پھلکی تھی۔ ان کے زمانہ میں کپڑوں کی گڑیاں بنتی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کس چیز کی بنی ہے۔ دکھائی کم دیتا تھا۔ پھر بھی بہت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گڑیا کو دیکھا۔ گردن کو ذرا مروڑا۔ وہ تو تاگے سے جمی ہوتی ہی ہے۔ ٹوٹ کر ہاتھ میں آگئی۔ اندر سے سپیدی جو دیکھی سمجھیں شاید شکر کی گڑیا ہے۔ چپکے۔ سے سارے کا سارا سر منہ میں رکھ لیا۔ چبایا مگر کچھ مزا نہ آیا۔ یہ تھوکنا چاہتی تھیں کہ اتنی دیر میں سعیدہ آگئی۔ اس نے جو دیکھا کہ بڑی بی بیٹھی اس کی گڑیا کا سر چبا رہی ہیں تو اس نے ایک کہی نہ دو۔ ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور لگی غل مچانے۔ سارا گھر جمع ہو گیا کہ خدا جانے بچی کو بچھو نے کاٹ لیا یا کچھ چمٹ گئی۔ جب سعیدہ نے دیکھا کہ ہاں اب سب آگئے تو اس نے نانا چندو کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا۔ ہاتھ کا ہٹانا تھا کہ کریچ کر گڑیا کا سر بڑی بی کے منہ میں سے نکل پڑا۔ اس کے بعد جو نانی جان نے فیل لائی ہیں وہ بیان نہیں ہو سکتا۔ ایک تو بیچاری سعیدہ کی گڑیا کا سر چبا گئیں دوسرے الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے خود اس کے سر ہو گئیں کہ اس لڑکی نے زبردستی یہ سر میرے منہ میں ٹھونس دیا۔ وہ تو کہو بوا نصیبن یہ سارا تماشا شروع سے دیکھ رہی تھیں جو بی سعیدہ بچ گئیں۔ نہیں تو مفت میں ان کی گندی ہو جاتی۔

کچھ یاد ہے پیام جگر گوشۂ نبیؐ
گھبرا نہ جا مصائب و آلام دہر سے

اے بے وفا! خدا کے شہیدوں میں نام کر
پیمانِ عشق کا ذرا احترام کر

# دلچسپ معلومات

## بنارس ہندو یونیورسٹی

بنارس ہندو یونیورسٹی ۱۹۱۶ء میں قائم کی گئی تھی۔ سولہ سترہ سال کے قلیل عرصہ میں اس یونیورسٹی نے تمام ابتدائی مراحل طے کر لینے کے علاوہ اپنی زیر نگرانی ایسے ایسے صنعتی اور تعلیمی شعبے جاری کئے ہیں جن کی مثال ہندوستان میں نہیں ملتی۔ گزشتہ سولہ سال کے عرصہ میں یونیورسٹی نے ایک کروڑ باون لاکھ روپیہ جمع کیا جس میں سے صرف اکیس لاکھ روپیہ حکومت کی طرف سے ملا باقی ایک کروڑ اور اکتیس لاکھ روپیہ والیان ریاست اور ہندوستان کے عام باشندوں سے بطور چندہ لیا گیا۔ اس قدر رقم آج تک ہندوستان میں کسی تعلیمی ادارے کے لئے اتنے قلیل عرصہ میں جمع نہیں ہو سکی۔

اس وقت بنارس یونیورسٹی کے زیر نگرانی بیسیوں مختلف تعلیمی اور صنعتی ادارے قائم ہیں۔ عملی سائنس اور انجنیرنگ سے متعلق عملی کام سکھانے والے ادارے بھی قائم کئے گئے ہیں۔ اس سے قبل ہندوستانیوں کو ان کی تعلیم کے لئے انگلستان، جرمنی، امریکہ، جاپان وغیرہ ممالک کو جانا پڑتا تھا لیکن بنارس یونیورسٹی میں صنعتی تعلیم کا بندوبست ہو جانے کی وجہ سے متعدد نوجوانوں کے لئے روزگار کی نئی شاہراہیں نکل آئی ہیں۔ اس وقت بنارس یونیورسٹی کے ماتحت مختلف اداروں میں ساڑھے تین ہزار سے زائد طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یونیورسٹی نے ایک الگ شہر کی حیثیت اختیار کر لی ہے جو تیرہ سو ایکڑ رقبہ اراضی میں آباد ہے۔

## ڈاکٹر جیکبس کی تجویز

امریکہ کی ایک یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر جیکبس نے موجودہ زمانہ کی تہذیب و تمدن کے حالات کو آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کرنے کے لئے ایک دلچسپ اور قابل عمل تجویز پیش کی ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ پہاڑ میں ایک تہ خانہ کھودا جائے۔ اور اس میں موجودہ زمانہ کی تہذیب و تمدن سے متعلق تمام ضروری اشیاء جمع کر دی جائیں اس کے علاوہ سینما فلموں کے ذریعہ بھی موجودہ تہذیب و تمدن کے نمونوں کو محفوظ کر لیا جائے۔

ڈاکٹر صاحب مذکور کا خیال ہے کہ تمام ضروری اشیاء رکھنے کے بعد غار مذکور کا منہ بند کر دیا جائے اور اس پر ایک فولادی تختی پر یہ کتبہ لگا دیا جائے کہ آئندہ نسلیں اس غار کو ۸۰۰۰ء تک نہ کھولیں۔ گویا اس غار کو تقریباً چھ ہزار سال تک بند رہنے دیا جائے۔

آج کے ماہرین کو گزشتہ زمانہ کے حالات کی تحقیق کرنے میں بہت دقتیں پیش آتی ہیں اور ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور ٹھیکریوں کے ٹکڑوں کو جمع کر کر کے گزشتہ زمانہ کے حالات مرتب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر جیکبس کی تجویز کے مطابق آج سے چھ ہزار سال بعد کے لوگوں کو مذکورہ غار کی مدد سے ہمارے زمانہ کے حالات نہایت آسانی سے اور مکمل طور پر معلوم ہو جائیں گے۔

## سائنس اور فن زراعت

روس دنیا کے ان حصوں میں سے ہے جہاں سال کا اکثر حصہ برف پڑتی ہے اور موسم گرما کے دو یا تین مہینوں کے سوا ہر وقت سطح زمین

پر برف ہی برف دکھائی دیتی ہے۔ قدیم طریقوں کے مطابق وہاں
کے لوگ برف کا موسم شروع ہونے سے قبل گندم بوتے تھے۔
برف باری کے اختتام پر پودا اگتا اور گرمیوں کے موسم میں فصل
کاٹی جاتی تھی گویا ایک فصل کے تیار ہونے میں آٹھ یا نو ماہ صرف
ہو جاتے تھے۔

روس میں اشتراکی انقلاب کے بعد جہاں زندگی کے اور
شعبوں میں تبدیلی واقع ہو گئی ہے وہاں فن زراعت میں بھی
عظیم الشان تبدیلی ہوئی ہے۔ اب وہاں چھوٹے چھوٹے دستی ہلوں
کی بجائے بڑی بڑی مشینیں ہیں جو آن کی آن میں سینکڑوں بیگھہ
اراضی میں ہل چلا کر رکھ دیتی ہیں۔ مشینوں کی ترویج کے علاوہ
روس کے سائنس دانوں نے بیجائی کے طریقوں کو بھی بدل دیا ہے۔
اب وہاں آٹھ یا نو ماہ کی بجائے صرف تین ماہ میں گندم کی فصل تیار
ہو جاتی ہے۔ وہ برف باری کے موسم سے قبل بیج بونے کی بجائے
بیج کو مقررہ حرارت کے ماتحت پانی میں تر رکھتے ہیں اور برف باری
کا موسم ختم ہوتے ہی بیج کو زمین میں بو دیتے ہیں۔ اور فصل تین ماہ
کے اندر اندر کٹائی کے قابل ہو جاتی ہے۔ پرانے طریقہ کے ماتحت
بیج کئی ماہ تک برف کے نیچے پڑا رہتا تھا اس عرصہ میں جو تبدیلیاں
واقع ہوتی تھیں نئے طریقے کے مطابق اب وہی مراحل مقررہ
درجہ حرارت کے ماتحت بیج کو پانی میں تر رکھنے سے طے ہو جاتے
ہیں۔ اور اس طرح نو ماہ کی بجائے تین ماہ میں فصل تیار ہو جاتی ہے

## سنگاپور کی اہمیت

جنوب مشرقی ایشیا میں جزائر ملایا میں آبنائے ملاکا کے سرے
پر بیشمار چھوٹے چھوٹے جزیروں میں ایک جزیرہ سنگاپور بھی ہے۔
تھوڑا عرصہ قبل کوئی اس کے نام سے بھی واقف نہ تھا لیکن اب
سنگاپور بہت بڑا شہر بن گیا ہے جہاں دنیا کا سب سے بڑا بحری مرکز
بنایا ہے۔ چنانچہ اس وقت وہاں پر زبردست جنگی جہاز اور تین ہزار بحری
فوج متعین ہے۔ اس کے علاوہ تھوڑے عرصہ سے یہاں ہوائی
فوج کا بھی ایک زبردست مرکز بنایا جا رہا ہے۔

سنگاپور بحر ہند اور بحر الکاہل کا دروازہ ہے۔ آسٹریلیا
ہندوستان اور چین و جاپان کو راستے یہیں سے گزرتے ہیں اس
لئے برطانیہ کی خواہش ہے کہ سنگاپور کو اس قدر مضبوط کر دیا جائے
کہ جاپان یا کوئی اور طاقت حملہ کرے تو یورپ سے مدد آنے
تک اپنی حفاظت آپ کر سکے۔ چنانچہ ماہرین کا خیال ہے کہ
پشاور کے بعد سنگاپور دنیا کی سب سے بڑی فوجی چھاؤنی ہے۔

## مختلف ملکوں کی افواج اور ان کا خرچ

تمام دنیا کی حکومتیں زبردست جنگی تیاریوں میں معروف ہیں اور
لطف یہ کہ ایک ملک دس ہوائی جہاز تیار کرتا ہے۔ تو دوسرا بارہ
ہوائی جہاز بناتا ہے اور تیسرا ملک چین نہیں لیتا جب تک وہ
ان دونوں سے بڑھ نہ جائے اور اس طرح یہ سلسلہ ختم ہونے میں
نہیں آتا اور جنگی دیوتا کی بھینٹ چڑھانے کے لئے روز بروز زیادہ سے
زیادہ روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے۔

تازہ اطلاعات کے مطابق مختلف ممالک اپنی فوجی قوت پر
جو رقوم سال رواں میں خرچ کریں گی ان کی تفصیل حسب ذیل
ہے:-

روس اسی کروڑ پونڈ۔ جاپان ساڑھے چار کروڑ پونڈ
انگلستان سولہ کروڑ۔ فرانس ساٹھ کروڑ پونڈ۔ اور جرمنی
گزشتہ تین سال سے بلحاظ اوسط پچاس کروڑ پونڈ سالانہ
کے حساب سے خرچ کر رہا ہے۔

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ دنیا کے مختلف
ممالک دیوانہ وار اپنی فوجی قوت کو مضبوط کرنے میں مصروف ہیں
اس کا کچھ اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ تمام دنیا کے ممالک کا
افواج پر خرچ ۱۹۲۵ء میں ستر کروڑ پونڈ تھا لیکن ۱۹۳۶ء
میں یہی خرچ ڈیڑھ ارب پونڈ یعنے گیارہ سال قبل کی نسبت
دوگنا ہو گیا +

# نعرۂ مستانہ

(از منشی سکھدیو پرشاد صاحب بسملؔ الہ آبادی)

گرفتارِ بلا بے تاب مجبور خستہ تن ہم ہیں — مگر اس پر بھی وجہ زینتِ رنگِ چمن ہم ہیں
ستمگر فتنہ جو عیار ظالم سے کوئی کہہ دے — کہ سودا ہے وطن کا سر میں شیدائے وطن ہم ہیں
لباسِ حبِ ملکی تیغ کے رنگ اپنا دکھائے گا — بنیں گے جس سے پھاہے زخم کے وہ پیرہن ہم ہیں
ہماری روشنی سے روشنی عالم میں پھیلی تھی — اندھیرا دور جس سے ہو گیا ایسی کرن ہم ہیں
ملے گی چادرِ خاکِ وطن بے جان ہونے پر — کفن والے نہ یہ سمجھیں کہ محتاجِ کفن ہم ہیں
ہمارے واسطے زنداں نہیں ہے بزمِ جنت ہے — فروغِ انجمن زینت دہِ صدر انجمن ہم ہیں
فدا کر دیں گے لیلائے وفا پر جانِ شیریں تک — کمالاتِ جنوں میں قیس ہم ہیں کوہکن ہم ہیں
ہمیں تعظیم سے ہے کام مندر ہو کہ مسجد ہو — حرم میں شیخ ہم ہیں بتکدے میں برہمن ہم ہیں
ارادہ ہے بڑھا کر ارتباطِ ہندو و مسلم — دکھا دیں دشمنوں کو صورتِ گنگ و جمن ہم ہیں
وہ صدمے آندھیوں کا زور وہ سیلابِ دریا کا — حفاظت چاہیے ہر دم کہ بنیادِ کہن ہم ہیں
گرفتارِ مصائب ہو کے غم ہو کیا مصائب کا — زمانہ جانتا ہے خوگرِ دار و رسن ہم ہیں

نہ وہ اگلا ترانہ ہے نہ وہ اگلا فسانہ ہے
زمانے میں ہمارا اب گیا گزرا زمانہ ہے

وطن پر مٹنے والوں کی جو ہمت سمجھتے ہیں — یہی جنت ہے اس کو رشکِ صد جنت سمجھتے ہیں
جنوں یہ ہے کہ تکمیلِ ارادہ بھی جلد ہو جائے — مصیبت کیا مصیبت ہے اسے راحت سمجھتے ہیں
یہی جینے کی صورت ہے تو لعنت ایسے جینے پر — یہی ہے زیست تو اس زیست کو زحمت سمجھتے ہیں
کبھی تقدیر پلٹا کھائے گی اچھے دن آئیں گے — سمجھتے ہیں مآلِ گردشِ قسمت سمجھتے ہیں
وطن پر مرنے والوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا — کسی ملت کو دنیا میں یہ کب ملت سمجھتے ہیں
فنا ہونے کے معنی عرفِ حقیقت میں فنا ہونا — ہم اس کے حسنِ مطلب کو محبت سمجھتے ہیں
جفا والوں سے ڈر سکتے نہیں ہرگز وفا والے — فدا ملت پہ ہیں یہ مکتبِ ملت سمجھتے ہیں
انھیں ہے جبر سے مطلب اسی پر ناز ہے ان کو — ہمیں ہے صبر کی طاقت اسے طاقت سمجھتے ہیں
غلامی ہو کہ ہم آزادی ہیں اک تصویر کے دو رخ — اسے دوزخ سمجھتے ہیں اسے جنت سمجھتے ہیں
کسی کے قبضۂ قدرت میں رہنا کوئی عزت ہے — جو اہلِ درد ہیں وہ اسے ذلت سمجھتے ہیں
تمہارا کام ہے اقرار کرنا پھر مکر جانا — یہ عادت ہم سمجھنے میں یہ ہم خصلت سمجھتے ہیں

وفا سے کام ہے ان کو وفا سے کام رکھتے ہیں
جفا والے عبث بسملؔ پہ سو الزام رکھتے ہیں

# جذبہ خودداری

(روسی مصنف الیگزینڈر کوپران کے ایک افسانہ کا ترجمہ)

جولائی کا مہینہ تھا۔ گرمی کی شدت تھی۔ پتھر کی بنی ہوئی عمارتیں دہکتی ہوئی بھٹی کی طرح گرم تھیں۔ مکان کی چمکتی ہوئی سفید دیواروں کی طرف نظر اٹھانا محال تھا۔ سیمنٹ کے فرش پہ پاؤں جلے جاتے تھے۔ سمندر بھی سورج کی زرد روشنی میں زرد رو اور بے حس و حرکت پڑا تھا۔ بازاروں کی فضا گرد آلود تھی۔

کسی تھیٹر کی ڈیوڑھی میں مقامی بیرسٹروں کی ایک چھوٹی سی جماعت گزشتہ فسادات کے مصیبت زدگان کی قانونی امداد کے متعلق غور و خوض کر رہی تھی۔ ان کا کام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ ان میں قانون داں حضرات میں تمام کے تمام نوجوان اور ایماندار اشخاص تھے۔ نشست بالکل غیر رسمی تھی۔ سب کے سب چھوٹی چھوٹی سنگ مرمر کی میزوں کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ صاحب صدر ایک اونچے تختے کے نزدیک کھڑے تھے۔ یہاں سماوار میں چائے اور مٹھائی رکھی تھی۔

گرمی کی شدت سے سب تھکے ہوئے تھے اور کاروائی بہت سست تھی۔

صاحب صدر ایک قد آور اور خوبصورت نوجوان تھے۔ وہ اس سوچ میں محو تھے کہ کس طرح کارروائی کو ختم کر کے اپنے ٹھنڈے بالکل پر فضا بنگلے پر پہنچ جائیں گے اور سمندر کے ٹھنڈے اور فرحت بخش پانی میں غوطے لگائیں گے۔ انھوں نے بیزاری سے کاغذات کو ادھر ادھر کرتے ہوئے کہا:

"اچھا تو مسٹر جوزف۔ روبن کے مقدمہ کی پیروی کریں گے ......

لیکن شاید کہ ابھی ان کی کارروائی کے متعلق بیان دینا بھی باقی ہے؟"

صاحب صدر دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر اٹھے تاکہ اجلاس کے ختم ہونے کا اعلان کریں۔ لیکن ابھی کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ چپراسی نے دروازہ کھولا اور آگے بڑھ کر کہا "سات اشخاص باہر کھڑے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ آپ انھیں اندر آنے کی اجازت دیں۔"

صاحب صدر نے کمیٹی کے تمام ارکان کی طرف تیزی سے نظر دوڑائی

"آپ کی کیا رائے ہے؟"

"ان سے کہیے کہ پھر تشریف لائیں!"

"ان سے کہہ دو کہ اپنی ملاقات کا مقصد لکھ کر بھیجیں۔"

"کہیں وہ جلدی سے اندر نہ چلے آئیں ..... جلد فیصلہ کیجیے۔"

"جہنم میں جائیں۔ اُف! کتنی گرمی ہے۔"

"اچھا انہیں آنے دیجیے۔" صاحب صدر نے جھنجھلا کر اپنے سر سے اشارہ کیا "مہربانی کیجیے اور میرے لئے ایک گلاس پانی لائیے لیکن خیال رہے کہ سرد ہو۔"

چپراسی نے دروازہ کھول کر برآمدے کی طرف آواز دی "اندر آ جائیے۔"

تب نہایت عجیب و غریب وضع قطع کے سات اشخاص ڈیوڑھی میں گھس آئے۔ سب سے پہلے ایک مضبوط۔ خود اعتماد شخص چست لباس پہنے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اس کی بیازی رنگ کی سفید دھاری دار قمیض اور کوٹ کے کالر پر سرخ رنگ کا پھول سب سے نمایاں تھا۔ چہرہ بڑی بڑی مونچھوں سے مزین تھا۔ دھوپ سے بچنے کے لئے آنکھوں پر رنگدار عینک اور ہاتھوں پر دستانے پہنے تھا۔ دائیں ہاتھ میں رومال اور بائیں میں اپنی چھڑی لئے ہوئے تھا۔ دوسرے چھ اشخاص ایک دوسرے سے اس قدر مختلف تھے کہ بظاہر کسی کو بھی ان میں سے کوئی مناسبت معلوم نہ ہوتی تھی۔ یہ غیر مناسبت ان کے لباس تک ہی محدود نہ تھی بلکہ ان کے اعضا بھی بہت بے ترتیب معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک کی شکل قدیم رومنوں کی سی تھی لیکن اس کا لباس بوسیدہ اور پھٹا ہوا تھا۔ دوسرا ایک عمدہ سا کوٹ پہنے ہوئے تھا لیکن اس کے نیچے لیکن اس کے نیچے ایک میلی سی قمیض نکلی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ ان کی ہیئت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب اصحاب جرائم پیشہ ہیں۔ یہ تمام اشخاص باوجود نوجوان ہونے کے زندگی کا وسیع

تجربہ رکھتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ دلیری، جرأت، بیباکی اور چالاکی ان کی رگ رگ سے ٹپکی پڑتی تھی۔

سب سے پہلے اندر داخل ہونے والے عینک پوش نے ایک خاص انداز سے اپنا سر جھکایا اور کسی قدر سوالیہ لہجے میں کہا۔

"صاحب صدر"؟

"کہیے۔ میں صدر ہوں کہو! کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ہم — تمام جنہیں آپ اپنی خدمت میں حاضر پاتے ہیں [illegible] کار خوف انجمن دزداں کے نمائندے ہیں۔"

بیرسٹر اپنی کرسیوں پر بے چینی سے ہلنے شروع ہوئے۔

صاحب صدر نے اپنی حیرانی میں کرسی کی پشت سے آسرا کرتے ہوئے پوچھا "کیسی انجمن"؟

"انجمن دزداں" عینک پوش نے اطمینان سے جواب دیا "اور جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میرے رفقا نے مجھے اپنا لیڈر منتخب کرنے میں میری عزت افزائی کی ہے۔"

"خوب ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے آپ لوگوں سے مل کر مسرت ہوتی ہے"۔ صاحب صدر نے گھبراہٹ سے کہا۔

"شکریہ۔ ہم ساتوں عام چور ہیں — قدرتی طور پر مختلف محکموں کے ہیں ہی۔ انجمن نے ہمیں اس بات کی اجازت دی ہے کہ ہم آپ کی معزز کمیٹی کے سامنے مدد کے لیے درخواست کریں۔"

صاحب صدر یہ سن کر اور بھی گھبرائے اور اسی پریشانی میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا: "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بالکل ٹھیک ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس کا تعلق؟ ۔ ۔ ۔ ۔"

"حضرات! جس امر کے متعلق ہمیں جناب کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا وہ نہایت سادہ اور مختصر ہے۔ اس کے اظہار میں کچھ زیادہ وقت صرف نہ کروں گا۔ صرف چند منٹوں میں اسے آپ کی خدمت میں عرض کر دوں گا۔ مجھے احساس ہے کہ وقت بہت گزر چکا ہے اور آپ حضرات کو یہاں سے واپس جانا ہے۔"

آپ کو گزشتہ فسادات کے متعلق اچھی طرح سے معلوم ہوگا اور ساتھ اخبارات کے مقالات بھی جو وقتاً فوقتاً اس نزاع کے متعلق شائع ہوتے رہے ہیں آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے۔ اکثر دفعہ ان میں اس بات کا اظہار کیا گیا ہے کہ ان فسادات کے شعلوں کو بھڑکانے والے پولیس کے تنخواہ دار لفنگے، بدمعاش، شرابی اور نچلے طبقے کے لوگ تھے اور کہ ان میں چور بھی شامل تھے۔

پہلے پہل تو ہم نے ان باتوں کی طرف توجہ نہ دی لیکن آخر کار ہم نے اس غلط اور بے سروپا الزام کے خلاف احتجاج کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا اور فیصلہ کیا کہ یہ احتجاج فہمیدہ سوسائٹی کے ہر فرد تک پہنچا دی جائے۔ مجھے بخوبی علم ہے کہ ہم قانون کی نظروں میں مجرم اور سوسائٹی کے دشمن گردانے جاتے ہیں۔ لیکن حضرات! صرف ایک لمحہ کے لیے غور کیجیے کہ سوسائٹی کے اس دشمن کی حالت کیا ہوتی ہے جبکہ اس کو ایک ناکردہ گناہ کا ذمہ قرار دیا جاتا ہے اور اس گناہ کا ملزم جس کا نہ صرف وہ مرتکب ہی نہیں ہوا بلکہ جس کو اپنی تمام قوت سے غلط ثابت کرنے کے لیے تیار ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسا شخص ایسی بے انصافی کو ایک عام خوش قسمت شہری سے زیادہ محسوس کرے گا۔ ہم اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ جو الزام ہمارے خلاف عاید کیا جاتا ہے وہ حقیقت اور منطق دونوں لحاظ سے بے بنیاد ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اگر آپ کی کمیٹی کے معزز ارکان پر یک بار خاطر نہ ہو تو اس کے ثبوت میں دلائل پیش کروں۔"

"کہیے"۔ صاحب صدر نے آہستگی سے کہا۔

"ضرور ۔ ۔ ۔ ضرور ۔ ۔ ۔"۔ تمام بیرسٹروں نے بلند آواز سے پکارا۔

"میں اپنے تمام رفقا کی طرف سے آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ حضرات! یقین کیجیے کہ آپ کو ہمارے آبرو لیکن دشوار پیشہ کے نمایندوں کی طرف توجہ دینے پر کبھی بھی افسوس نہ ہوگا۔"

"لیکن قبل ازیں کہ میں کچھ کہوں۔ امید ہے کہ صاحب صدر مجھے پانی پینے کی اجازت دیں گے۔ چپراسی! دیکھو! لیمونیڈ اور انگریزی بیر کی ایک بوتل لاؤ۔ حضرات! میں اپنے پیشہ کے اخلاقی پہلو کے متعلق کچھ نہ کہوں گا اور نہ میں اس کی معاشرتی نوعیت پر رائے زنی کروں گا۔ یقیناً آپ (Proudhan) کی مشہور تشبیہ (Paradox) سے واقف ہوں گے۔ یہ وہ بات ہے جس کو آج تک مذہبی واعظوں [illegible] کے بزرگانہ نصائح رد نہیں کر سکے۔ فرض کیجیے کہ کوئی شخص اپنی چالاکی اور فریب سے

ایک کثیر رقم جمع کرتا ہے اور مرنے پر یہی سرمایہ اپنے لڑکے کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ اور وہ لڑکا کیا ہے؟ جہالت۔ حماقت اور سستی کا مجسمہ۔ فہم و فراست سے عاری۔ غرضیکہ سوسائٹی کا عضو معطل ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہے کہ ایک لاکھ روپیہ ایک ہزار کی مزدوری کے برابر ہے۔ لیکن یہ غیر منصفانہ سلوک کیوں؟ اس کے وجوہات کیا ہیں؟ ہماری عقل سے باہر ہے۔ تو پھر کیوں نہ کہا جائے کہ ہمارا پیشہ افراد کے ہاتھوں میں دولت کے ناجائز جمع ہونے کی تقسیم کا ایک ہتھیار ہے۔ انسانی شخصیت کی زبردستی۔ خود سری۔ سینہ زوری۔ بے پروائی اور موجودہ سوسائٹی کے نظام سرمایہ داری کے خلاف بمنزلہ احتجاج کے ہے۔ آج نہیں تو کل وہ دن ضرور آئے گا جس دن رشیا کا یہ نظام معاشرتی انقلاب سے یکسر بدل دیا جائیگا۔ ذاتی جائیداد ایک افسانہ بن جائے گی اور ہم اس کے وجود کو بھول جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی افسوس! ہم بھی روئے زمین سے مٹ جائیں گے۔

مقرر چپراسی کے ہاتھ سے طشتری پکڑنے کے لیے رکا اور اسے پکڑ کر نزدیک ہی میز پر رکھ لیا۔ اور بیرسٹروں کی طرف مخاطب ہوا۔

"حضرات! معاف کیجئے ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں! دیکھو بھئی یہ لیتے جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور جاتے ہوئے دروازہ بند کرتے جانا!"

"بہت اچھا حضور!" چپراسی نے مذاقاً کہا۔ مقرر نے نصف گلاس پیا اور اپنی تقریر کو جاری رکھا: بہرحال مجھے اس کے سیاسی نہ اخلاقی اور اقتصادی پہلو پر کچھ نہیں کہنا۔ میں آپ کی توجہ سے ناجائز فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا اور نہ ہی آپ کو زیادہ تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ لیکن بہرحال میں اس بات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارا پیشہ بھی ایک فن لطیف ہے۔ فن لطیف کا ہر عنصر اس کے اجزا میں شامل ہے ــــ فہم و فراست۔ وسعت نظر۔ اتقاء۔ قوت ایجاد۔ اولوالعزمی اور پھر ان کے ساتھ ایک طویل تجربہ کی ضرورت ہے کہ کوئی اس پیشہ کو اختیار کرے۔ ہاں اگر کوئی چیز اس میں مفقود ہے تو وہ صرف نیکی ہے۔ حضرات اگرچہ میری ان بیکار باتوں سے آپ کا وقت ضائع ہوتا ہے لیکن میں مجبور ہوں کہ اپنے بیان کی تکمیل اور وضاحت کے لیے مختصر طور پر ان امور کا تذکرہ کردوں۔ دوسرے اشخاص کے سامنے چوری کے پیشہ کا تذکرہ کرنا بالکل لغو اور بیہودہ معلوم ہوتا ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ایک حقیقت ہے۔ ایسے انسان موجود ہیں جن کی یادداشت غیر معمولی طور پر تیز ہے۔ ایسے بھی ہیں جن کی نظر بہت تیز ہے۔ اور میں خود اعتمادی۔ ہاتھ کی صفائی اور قوت لامسہ کے جوہر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف خدا کی زمین پر ناخن کے پوروں سے روپیہ پیدا کرنے کے لیے وجود میں آئے ہیں۔ جیب کتروں کے پیشہ کے لیے ضرورت ہے کہ انسان میں غیر معمولی سبک رفتاری اور پھرتی کے جوہر موجود ہوں۔ ان کی حرکات بالکل جچی تلی ہوں۔ قوت مشاہدہ تیز ہو اور حاضر جوابی کی خصوصیت ناپید نہ ہو۔ بعضوں کو صرف لوہے کی الماریاں کھولنے میں مہارت ہوتی ہے۔ وہ اپنے بچپن ہی سے پیچیدہ پیچیدہ مشینوں میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ اور آخر میں حضرات ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن میں شخصی جائیداد کے خلاف ایک قدرتی جذبہ موجود ہوتا ہے۔ آپ خواہ ان تمام امور کو پستی اور بداخلاقی پر کیوں نہ محمول کریں لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کل چور کو کبھی کسی پھندے میں نہیں پھنسا سکتے۔ اگرچہ آپ کیسا ہی لالچ اس کو دیں۔ کتنا ہی محفوظ اور آسان ذریعہ معاش پیش کریں اور کیسی ہی حسین و جمیل عورت کی صحبت اس کے لیے مہیا کریں۔ لیکن یہ سب کیوں؟ صرف اس لئے کہ اس پیشے میں اس کے لیے مستقل دلکشی۔ مسحور کن خطرہ۔ خوش آئند قلبی بے چینی اور زندگی کی پُرجوش حرکت اور انبساط موجود ہوتا ہے۔ آپ تالوں۔ سیفوں۔ ٹیلیفون۔ پولیس فوج اور قانون کی حفاظت سے مسلح ہیں۔ لیکن ہم صرف اپنی پھرتی۔ عیاری اور بے خوفی سے۔ ہم بھیڑیے ہیں اور سماج صرف ایک چوزہ ہے۔ جو کتوں کی حفاظت میں ہے۔ آپ سے مخفی نہیں کہ ہمارے سب سے زیادہ فنی طبائع اور خداداد استعداد سے بہرہ ور طبیعتیں گھوڑوں کی چوری میں ہیں۔ آپ ان سے اور توقع بھی کیا کر سکتے ہیں؟ زندگی ان باحوصلہ شہسواروں کے لیے اتنی حقیر۔ اتنی بے لطف۔ اور اتنی ناقابل برداشت طور پر اداس ہے۔"

"میں اب افکار کا ذکر کروں گا۔ حضرات! یقیناً آپ نے ایسی چوریوں کے متعلق پڑھا ہوگا جو اپنی ترکیب اور عمل میں فوق الفطرت تھیں۔ اخبارات کی سرخیوں میں وہ عجیب و غریب رہزنی یا پُراسرار فریب یا ایسے ہی کسی اور نام سے پکاری جاتی ہیں۔ ایسے واقعات پر ہمارے متمول امرا ہاتھوں کو ملاتے ہوئے کہتے ہیں "کیسی خوفناک بات ہے!" اگر ان کی یہی قابلیت۔ انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ۔ خود اختیاری۔ قوت ایجاد۔ دلیری اور بے نظیر قوت اداکاری صرف نیکی کی طرف راغب ہوجائے تو کتنا غیر معمولی کلب کی بہبود کا باعث ہو۔ لیکن یہ ایک عام بات ہے کہ

یہ متمول امرا خدا نے خاص طور پر عام اور بازاری باتیں کرنے کے لیئے پیدا کیے تھے۔ میں خود بعض اوقات ـــــ اگرچہ کسی قدر جذباتی آدمی ہوں ـــ مجھے اعتراف ہے ـــــ میں خود بعض اوقات اسکنڈ بارک یا ساحل سمندر پر غروب آفتاب کے خوبصورت منظر کی تعریف کیا کرتا ہوں۔ اور مجھے ہر وقت یہی توقع ہوتی ہے کہ میرے نزدیک ہی کوئی بول اٹھے گا کہ کیا خوبصورت منظر ہے۔ اگر اس کو کانوں پر منتقل کر دیا جائے تو شاید ہی کوئی یقین کرے: میں آوارہ گرد کھتا ہوں تو قدرتی طور پر میری نظر ایک خوش نما ... دولت مند شخص پر پڑتی ہے جو صرف کسی دوسرے کی کہی ہوئی بات کو دہراتا ہے اور ایسے ظاہر کرتا ہے کہ گویا اپنی طرف سے کہہ رہا ہے۔ جہاں تک ہمارے پیارے وطن کا تعلق ہے یہ متمول انسان اسے بھنی ہوئی مرغی تصور کرتا ہے۔ اور یہ سمجھتا ہے کہ اگر تم اس مرغی کے بہترین حصے کر اپنے لیئے کاٹ لینے میں کامیاب ہو گئے ہو تو ایک کونے میں بیٹھ کر اسے اڑاؤ اور خدا کا شکر کرو۔ لیکن حقیقت میں یہ شخص کسی ہستی کا مالک نہیں۔ ناشائستگی کے تنفر میں میں اصلی مقصد سے کسی قدر دور جا پڑا اور اس کے لیئے معافی چاہتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ فہم ادراک اور زندہ غیب اگرچہ مذہب سے کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں پھر بھی وہ زندہ اور خوبصورت رہتے ہیں۔ ترقی قانون ہے ـــــ اور چوری کی تخلیق کا کچھ باعث بھی ضرور ہے۔

ہاں تو چوری کرنا اتنا آسان اور خوشگوار بھی نہیں جتنا کہ سرسری نظر میں معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ایک طویل تجربے۔ ان تھک کوشش اور حقیقی محنت کی ضرورت ہے۔ اس میں بیسیوں ایسے تیز اور چالاک ترکیبوں کی ضرورت ہے کہ جن کو چالاک سے چالاک بازیگر بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیئے کہ میں صرف باتوں ہی میں وقت صرف نہ کروں میں آپ کے سامنے چند تجربات سرانجام دوں گا۔ آپ میرے رفقا پر پورا اعتماد رکھیں۔ اس وقت ہم سب قانونی آزادی سے بہرہ اندوز ہیں اور اگرچہ عام طور پر ہماری دیکھ بھال کی جاتی ہے ہم میں سے ہر ایک جانا جاتا ہے اور ہماری تصویریں تفتیش جرائم کے محکموں کے البم کی زینت بنی ہوئی ہیں تاہم اس وقت ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی ذات کو پوشیدہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ میں سے کوئی صاحب آئندہ زندگی میں ہم میں سے کسی کو ذرا مختلف حالات میں پائیں تو ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ اپنے منصبی اور شہری فرائض کو مد نظر رکھتے ہوئے عمل کریں۔ آپ کی توجہ اور مہربانی کے صلے میں ہم اعلان کرتے ہیں کہ آپ کی جان و مال کو ہمارے ہاتھوں کبھی ضرر نہ پہنچے گا۔

(Seesaw)

مقرر نے اپنے رفقا کی طرف منہ پھیر کر حکم دیا: "سیسائے اعظم کیا آپ ادھر تشریف لائیں گے!"

ایک قوی ہیکل انسان جس کے ہاتھ اس کے گھٹنوں تک پہنچتے تھے اور جس کی پیشانی اندر کو دھنسی ہوئی تھی آگے بڑھا۔ اور گھبراہٹ میں احمقانہ طریق پر آنکھیں ملتے ہوئے بولا:

"یہاں میں کیا کر سکتا ہوں؟"

وفد کے لیڈر نے کمیٹی کے ارکان کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا۔

"حضرات آپ کے سامنے ہماری انجمن کا ایک معزز رکن کھڑا ہے۔ لوہے کی الماریاں اور دیگر آہنی صندوقوں کو کھول لینا رکن موصوف کی خصوصیت ہے۔ اکثر اوقات دھات کو پگھلانے کے لیئے یہ بجلی کی امداد بھی حاصل کر لینے میں مہارت رکھتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہاں کوئی ایسی شے نہیں جس پر یہ اپنا کمال ظاہر کر سکیں۔ تالا خواہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو اسے کھول دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے . . . . ہاں! وہ دروازہ ـ کیا وہ مقفل نہیں؟"

ہر ایک کی نظر دروازے کی طرف اٹھی۔ وہاں ایک نوٹس آویزاں تھا:

"سٹیج کا دروازہ ـ پرائیویٹ"

"ہاں دروازہ مقفل ہے" صاحب صدر نے کہا۔

"بہت خوب۔ سیسائے اعظم۔ کیا آپ کرم فرمائیں گے؟"

"یہ تو کچھ بھی نہیں" سیسائے اعظم نے آہستگی سے کہا۔

وہ دروازے کے نزدیک گیا۔ احتیاط سے اس کو ہلایا۔ اپنی جیب سے ایک ننھا سا چمکدار اوزار نکالا۔ چابی کے سوراخ تک جھکا۔ اپنے اوزار سے تالے کو ایک خفیف سی جنبش دی۔ پھر یکدم اٹھا اور دروازے کو کھول دیا۔ صاحب صدر اپنی گھڑی لیئے بیٹھے تھے۔ یہ تمام مراحل کل دس سکنڈ میں طے ہو گئے۔

"شکریہ سیسائے اعظم شکریہ۔ آپ اپنی جگہ پر واپس تشریف لے جائیں۔"

لیکن صاحب صدر کسی قدر خوفزدہ ہو کر بولے: "معاف کیجئے گا۔ یہ سب بہت سبق آموز اور دلچسپ تھا لیکن . . . . کیا یہ آپ کے معزز رفیق کے

اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے گھڑی واپس دیتے ہوئے کہا "لے لیجئے"
بیرسٹر نے گھبراہٹ جواب دیا "لیکن ۔ ۔ ۔ یہ سب کچھ نہایت پھرتی سے کیا گیا۔ مجھے قطعاً معلوم ہی نہیں ہو سکا۔"

"یہ ہمارا پیشہ ہے" پاشا نے فخریہ طور پر کہا۔

وہ واپس ہو کر اپنے ساتھیوں میں جا بیٹھا۔ اسی دوران میں منتظم بیرکا ایک گلاس پیا اور کمیٹی کے ارکان کی طرف متوجہ ہوا۔

"حضرات! ہمارا ایک اور دوست تاش کے چند معمولی معمولی کرتب دکھائے گا۔ جو کہ میلوں، رفاہی کشتیوں، اور گاڑیوں پر کئے جاتے ہیں۔ لیکن شاید آپ ان تماشوں سے اکتا گئے ہوں گے۔"

"جی نہیں۔ یہ نہایت دلچسپ ہیں" صاحب صدر نے جواب دیا "لیکن اگر آپ اسے بدتمیزی پر محمول نہ کریں تو آپ سے ایک بات دریافت کروں اور یہ کہ آپ کی خصوصیت کیا ہے؟"

"بدتمیزی ۔ ۔ ۔ ہرگز ۔ ۔ ۔ نہیں جناب یہ بدتمیزی کیسے ہو سکتی ہے ۔ ۔ ۔ میں بڑی بڑی جواہرات کی دکانوں کو لوٹتا ہوں ۔ ۔ ۔ اور میرا دوسرا کام بنکوں سے متعلق ہے۔"

"یہ مت سمجھئے کہ یہ کام دوسرے کاموں سے آسان ہے۔ اس کام کے لئے میں نے جرمن، فرانسیسی، انگریزی اور اطالوی زبان میں مہارت بہم پہنچائی ہے۔ باقی چھوٹی چھوٹی تمام زبانوں میں مجھے دسترس حاصل ہے۔ بوقت ضرورت ان کو بھی کام میں لاتا ہوں۔ لیکن صاحب صدر کیا میں کچھ اور تجربات آپ کے سامنے پیش کروں؟"

صاحب صدر نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

"بدقسمتی سے وقت بہت گزر چکا ہے کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ اپنی تشریف آوری کے اصل مقصد کی طرف توجہ فرمائیں؟ اور اس کے علاوہ جو تجربات ہم نے دیکھے ہیں ان سے ہم کو آپ کے معزز رفقاء کی استعداد کا بخوبی یقین ہو گیا ہے ۔ ۔ ۔ کیوں مسٹر آئزک یہ صحیح ہے نا؟"

"ہاں۔ ہاں ۔ ۔ ۔ بالکل" مخاطب بیرسٹر نے جواب دیا۔

"بہت خوب" وفد کے لیڈر نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ اور اپنے رفقاء میں سے ایک نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "پیارے کونٹ۔ اپنے اوزاروں کو بند کر دیجئے۔ اب ان کی ضرورت نہیں۔ حضرات اب مجھے صرف چند الفاظ اور کہنے ہیں۔ اور وہ یہ کہ اگرچہ ذی اثر لوگوں اور امراء کا طبقہ ہمارے پیشہ کی سرپرستی نہیں کرتا۔ تاہم آپ اس بات میں میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ یہ ایک فن ہے اور فن بھی ایسا کہ جس میں علاوہ لگاتار محنت، خطرہ اور ناخوشگوار غلط فہمیوں کے کسی ایک ذاتی خصوصیات کی بھی ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس بات پر یقین کریں گے کہ اگرچہ سرسری نظر میں یہ پیشہ کتنا ہی عجیب کیوں نہ ہو تاہم اس کے ساتھ رابطہ پیدا ہو جانا اور اس کو چاہنا اور عزیز رکھنا ممکن ہے۔ معزز احباب! ایک لمحہ کے لئے فرض کر لیجئے کہ کسی مشہور شاعر کو جس کی نظمیں ملک کے بہترین جرائد کی زینت بنتی ہوں کوئی پبلشر ایک پیسہ فی شعر معاوضہ پیش کر کے خریدنا چاہے۔ یا آپ کے نوآباد اصحاب کے متعلق کوئی توہین آمیز بیان شائع کر دیا جائے یا الزام دھرا جائے کہ آپ طلاق کے مقدمات کے لئے شہادتیں پیدا کرنے میں اپنی روزی کماتے ہیں یا قہوہ خانوں میں بیٹھ کر موٹر ڈرائیوروں کی درخواستیں گورنر کے نام لکھا کرتے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ کے رشتہ دار، دوست اور شناسا اس بات کو باور نہ کریں گے۔ لیکن یہ افواہ اپنا زہریلا کام کر چکے گی اور آپ کو ایسے لمحات گزارنے پڑیں گے جس میں آپ کو روحانی اذیت پہنچے گی۔ اب ذرا اس بات کا بھی اندازہ فرمائیے کہ ایسا شرمناک اور بے سروپا الزام نہ صرف آپ کے نیک نام پر بلکہ آپ کی آزادی، صحت اور زندگی پر بھی حملہ آور ہو گی!"

"اخباروں کے توہین آمیز مقالات اور افتتاحیوں سے ہم چوروں کی بھی یہی حالت ہے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں ذرا اس کی وضاحت کر دوں۔ ایک نہایت لچر اور ذلیل جماعت بھی موجود ہے جس کو ہم لوگ "مال کے لاگے" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہم لوگوں کو انہیں سے خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ ان میں شرم اور ضمیر دونوں مفقود ہیں۔ کاہلی سستی اور کمینگی ان کے ذاتی اوصاف کا جزو اعظم ہیں۔ وہ نہایت بے سلیقہ چوریوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ وہ اسی بات پر قادر ہیں کہ کسی تاریک کوچہ میں کسی بچہ کو اپنا شکار بنا کر اس سے ایک پیسہ چھین لے جائیں یا نیند میں کسی کا گلا کاٹ ڈالیں۔ یا کسی نحیف بڑھیا پر ہاتھ صاف کریں۔ یہ لوگ ہمارے پیشہ کے لئے باعث ننگ و عار ہیں۔ ان کے لئے فن کی خوبی اور اصول کوئی شے نہیں۔ وہ حقیقی اور بلند پایہ چوروں کے پیچھے یوں لگے پھرتے ہیں جیسے کوئی گیدڑوں کا گروہ کسی شیر کے پیچھے پھرتا ہو۔ کہ کہیں شکار کا بچا ہوا ٹکڑا انہیں بھی میسر آئے۔ فرض کیجئے کہ میں نے کہیں سے کچھ قیمتی مال اڑایا ہے —— قطع نظر اس کے کہ اس کی دو تہائی ان لوگوں کو ادا کرنی پڑے گی جو اسے فروخت کریں گے یا وہ حفظ امن کی رسمی ادائیگی جو ہماری راست باز اور پاکدامن پولیس ہم سے وصول کرتی ہے —— مجھے ان مفت خوروں کو بھی کچھ نہ کچھ ادا کرنا پڑے گا۔ جنہیں کہیں سے اس واقعہ سے اتفاقاً سراغ مل گیا ہے۔

"پس ہم انہیں      کے نام سے پکارتے ہیں۔ ہم انہیں اسی لئے حصہ دیتے ہیں کہ وہ کہیں ہمارے خلاف اطلاع نہ کر دیں۔ اور عموماً ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنا حصہ وصول کر لینے کے بعد بھی پولیس کی طرف چل دیتے ہیں تاکہ ایک آدھ ڈالر اور وصول کریں۔ ہم ایماندار اور انصاف پسند چور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معززین! آپ

بیشک۔ اس پر ہنسئے۔ لیکن میں اسے دہراؤں گا —— ہم ایماندار چور اس بات سے سخت نالاں ہیں۔ ہاں! تو یہ لوگ بڑی خوشی سے ہمیں فسادات کی دعوت قبول کر لیتے ہیں۔ یہ خیال کہ کہیں ہمیں ان کے زمرے میں شمار نہ کر لیا جائے ہمارے لئے اس سے بھی کہیں زیادہ بے عزتی کا باعث ہے کہ ہم پر فسادات میں حصہ لینے کا الزام دھرا جائے۔

"حضرات! جبکہ میں تقریر کر رہا تھا۔ میں نے اکثر آپ کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں - ہماری اس جگہ پر موجودگی۔ آپ سے مدد کی درخواست اور سب سے زیادہ یہ غیر متوقع بات کہ چوروں کی کوئی منظم جماعت موجود ہے جس کے ارکان چوری پیشہ ہیں۔ یہ سب باتیں اتنی نئی ہیں کہ خواہ مخواہ مسکراہٹ کی تحریک ہو سکتی ہیں۔ لیکن اب میں اپنے قلب کی گہرائیوں سے اپنے احساسات کا اظہار کروں گا۔ آؤ کہ اپنے تکلفات کو بالائے طاق رکھ دیں۔ اور چند کھلی کھلی باتیں کریں۔

"تقریباً ہم سب تعلیم یافتہ ہیں۔ اور سبھی کتابوں کے شوقین ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جب تک یہ بدقسمت۔ شرمناک۔ کمینہ اور بزدلانہ جنگ جاری رہی ہمارے دل مجروح نہیں ہوتے رہتے اور کیا شرم سے ہمارے رخسار جلتے نہیں رہے؟ کیا ہماری روحوں کو اذیت نہیں پہنچتی رہی جبکہ ہمارے عزیز ملک کو کوڑوں سے پیٹا جاتا رہا۔ پاؤں کے نیچے کچلا جا رہا اور ہم۔ برانگیختہ اور دیوانے انسان پر گولیاں چلاتے رہے اور اس کے منہ پر تھوکتے رہے؟ کیا آپ یقین نہ کریں گے کہ ہر قدم جو آزادی کی طرف اٹھایا جاتا ہے ہم انتہائی مسرت اور خوشی سے اس کا خیر مقدم کرتے ہیں؟

"ہم سمجھتے ہیں —— ہم میں سے ہر ایک —— شاید کہ آپ اصحاب سے کسی قدر کم —— کہ فسادات کی اصل حقیقت کیا ہے۔ ہر دفعہ جب کبھی کسی بزدلانہ خلل کے بعد عوام کے اعتماد کو برقرار رکھنے میں ناکامی ہوتی ہے تو کوئی ایسی شخصیت جس تک رسائی ناممکن ہے۔ لوگوں کے اشتعال سے خوفزدہ ہو جاتی ہے —— اور پھر وہ شخصیت کیا کرتی ہے؟ یہی کہ اپنے فریب کا رخ غریب اور معصوم یہودیوں کی طرف پھیر دیتی ہے۔

"میں کسی قدر وضاحت سے دیکھ رہا ہوں کہ ظلم اپنی انتہا تک پہنچ گیا ہے۔ معاف کیجئے گا میں ذرا افسانہ انداز میں پیش کرتا ہوں: ایک قوم کہیں آباد تھی۔ تمام مندروں کے علاوہ اس کی ایک خاص معبد بھی تھی جس میں ایک دیوی رہتی تھی۔ اس کے سامنے ہمیشہ ایک پردہ لٹکا رہتا تھا اور اس پردے کے نزدیک محافظ پجاری ہر وقت بیٹھے رہتے تھے۔ ایک دفعہ کسی دلیر اور بہادر انسان نے اس پردے کو چاک کر ڈالا۔ تب سب لوگوں نے دیکھا کہ دیوی کی بجائے ایک بدہیئت بڑا بدصورت۔ برہنہ۔ اور خونخوار مکڑا بیٹھا تھا۔ لوگوں نے اس پر تھوکا پھینکے اور گولیاں چلائیں۔ اگرچہ اس کے اعضا علیحدہ علیحدہ ہو چکے تھے لیکن پھر بھی وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات کے غم و غصہ میں اپنی برہنہ ٹانگیں ملک کے تمام مندروں پر پھیلائے ہوئے تھا۔ اور پجاری جو موت کے منہ میں بیٹھے ہوئے تھے ہر انسان کو جو ان کی خوفزدہ اور لرزتے ہوئے ہاتھوں میں آتا تھا اس وحشی درندے کے منہ میں جھونک دیتے تھے"

"حضرات معاف کیجئے: جو کچھ میں نے کہا شاید بلا ربط اور بے معنی تھا لیکن میں ذرا پریشان تھا۔ ہم پیشہ ور چوروں کو سب سے زیادہ عجیب کہ یہ فسادات کس طرح تنظیم دیئے جاتے ہیں۔ ہم ہر جگہ پھرتے ہیں: قہوہ خانے ہوٹل۔ منڈیاں۔ قمار خانے۔ ریلوے سٹیشن اور بندرگاہیں ہماری آماجگاہیں ہیں خدا اور انسان دونوں کے سامنے قسم کھانے کے لئے تیار ہیں کہ ہم نے پولیس کو خود اس قتل عام کو تقریباً علانیہ تنظیم دیتے دیکھا ہے۔ ہم ان سب کو پہچانتے ہیں اور ہر رنگ میں ان کو شناخت کر سکتے ہیں۔ انہوں نے ہم میں سے بہتوں کو اس میں شامل ہونے کے لئے دعوت دی لیکن ہم میں سے اتنا بے اصول کوئی بھی نہ تھا کہ ان کے خوف سے ظاہرا طور پر بھی ان کی مدد کا وعدہ کر لیتا"

"البتہ - آپ جانتے ہیں کہ روسی سوسائٹی کے مختلف طبقے پولیس سے کس قسم کا برتاؤ کرتے ہیں؟ جو لوگ ان کی تیرہ و تاریک خدمات سے فائدہ اٹھاتے ہیں وہ بھی ان کی عزت نہیں کرتے۔ لیکن ہم ان پر ایک نہیں ہزار بار لعنت بھیجتے ہیں —— اس لئے نہیں کہ ہم میں سے بہتوں کو محکمہ تفتیش جرائم نے اذیت پہنچائی ہے۔ اور کسی رفیق کے راز کو چھپانے میں ربڑ اور چمڑے کے کوڑوں سے سزا دی جا چکی ہے —— اوہ! اس لئے بھی ارادہ سے نفرت کرتے ہیں - لیکن ہم تمام چوروں کو جنہیں جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے آزادی کی خواہش دیوانگی کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ اس لئے ہم اپنے قید کرنے والوں کو انسانی قلب کے انتہائی احساس تک نفرت کرتے ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ سن لیجئے۔ تین دفعہ مجھے پولیس نے اتنا پیٹا کہ میں تقریباً مر ہی چکا تھا۔ میرے پھیپھڑوں اور جگر کو ناقابل علاج نقصان پہنچ چکا ہے۔ ہر صبح خون تھوکتا ہوں حتیٰ کہ سانس نہیں لے سکتا۔ لیکن اگر مجھ سے کہا جائے کہ تحقیقاتی پولیس کے افسر کے ساتھ مصافحہ کرنے پر مجھے ہمیشہ کی مار پیٹ سے نجات مل جائے گی تو میں ایسا کرنے سے انکار کر دوں گا!

"اور پھر اخبارات کہتے ہیں کہ ہم نے ان ہاتھوں سے انسانی

خون میں بھیگے ہوئے روپے وصول کئے۔ حضرات نہیں! یہ ایک الزام ہے جو ہماری روحوں کو گھائل کئے جاتا ہے۔ اور ہمارے لئے ناقابل برداشت مصیبت کا باعث ہے۔ روپیہ۔ دھمکی اور لالچ۔ ان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو ہم کو اپنے بھائیوں کو قتل کرنے پر مجبور کر سکے۔ یا ہم کو ایسا کرنے والوں کا ساتھ دینے کی ترغیب دے سکے۔"

"میں اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کہوں گا" وفد کے لیڈر نے کہا "ہم میں سے بہتوں نے گزشتہ فسادات میں آفت رسیدوں کی حفاظت بھی کی۔ ہمارا دوست عیسائے اعظم ——— حضرات! آپ نے اسے دیکھا ہے۔ تب جا کر یہ یہودی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے ہاتھ میں لاٹھی لئے ہوئے مالک مکان کی حفاظت کی اور ڈٹ کر رہا جب کہ دوست اس کو بچا رہا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ عیسائے اعظم جسمانی طاقت میں ایک جن سے کم نہیں اور یہ بات اس علاقہ کے باشندوں سے مخفی نہیں لیکن حضرات! آپ ضرور میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ ایسے وقت پر عیسائے اعظم نے اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال کر ایک معصوم کی جان بچائی۔ ہمارے رفیق ماکوٹن نے ایک یہودی بڑھیا کی جان بچائی۔ ہجوم نے بڑھیا کو بچانے پر اس غریب کا سر پھوڑ ڈالا۔ بازو توڑ ڈالا اور ایک پسلی کے تین ٹکڑے کر دئے۔ یہ طریقہ تھا جس پر ہماری انجمن کے ارکان نے ان فسادات میں حصہ لیا۔ اور جن کو اس خدمت کا موقعہ نہیں ملا وہ لرزتے تھے اور اپنی بے بسی پر روتے تھے۔

"ہم میں سے کوئی بھی ان خوفناک ایام کو۔ ان خونی راتوں کو جبکہ غریبوں کے مکان نذر آتش کئے جاتے تھے اور جب بے بس اور بیچاری عورتیں روتی اور بین کرتی تھیں اور جب بچوں کی برہنہ نعشوں کے ٹکڑے بازاروں میں بکھرے پڑے ہوتے تھے نہ بھول سکے گا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کوئی نہیں سمجھتا کہ پولیس اور عوام اس بدقسمتی کا موجب تھے۔ یہ حقیر احمق اور ذلیل کیڑے [illegible] کی مانند ہیں جن کی آگ کی ڈور ایک ناکارہ [illegible] کے ہاتھوں میں ہے اور جیسے [illegible] ارادہ [illegible] چاہتا ہے [illegible] دیتا ہے۔"

"ہاں۔ حضرات! مقرر نے سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا "ہم چوروں کی توہین کی جاتی ہے۔ لیکن جب آپ کو چالاک۔ بہادر فرمانبردار آدمیوں کی جو آزادی کے رفع لفظ پر جانیں دینے کے لئے تیار رہیں ضرورت پڑے گی تو کیا آپ ہم لوگوں کو پیچھے ہٹا دیں گے؟ آپ کو یاد ہے کہ انقلاب فرانس میں سب سے پہلے جس ہستی نے اپنی جان قربان کی وہ ایک بازاری عورت تھی جو اس نے مورچہ پر جھنڈا گاڑ دیا اور گرتے ہوئے پکارا! تم سپاہیوں میں سے کسے جرأت ہے کہ ایک عورت کو گولی مارے؟" ہاں مجھے خدا کی قسم ہے۔ مقرر نے کسی قدر بلند آواز سے [illegible] ہاتھ [illegible] کہا [illegible] انہوں نے اس کو مار ڈالا لیکن اس کا اقدام بہادرانہ تھا اور اس کے الفاظ کا اثر غیر فانی۔

"اگر آپ اس عظیم الشان موقعہ پر ہم کو پیچھے ہٹا دیں گے تو ہم آپ سے کہیں گے کہ ایسے بے عیب فرشتو اگر انسانی خیالات میں مجروح کرنے، مار دینے اور کسی کا مال اور عزت چھین لینے کی طاقت ہوتی تو تم میں سے کون ایسا ہوتا کہ جس دن عوام کی سزا نہ دی جاتی۔ تب ہم آپ سے علیحدہ ہو کر چلے جائیں گے اور چوروں کا مستقل اور بہادرانہ مورچہ قائم کریں گے اور ایسی مسرت سے اپنی جانیں دے دیں گے کہ آپ ہم پر رشک کریں گے۔"

"لیکن اس دفعہ پھر میں اپنے مقصد سے دور نکل گیا۔ معاف کیجئے گا۔ بس میں ابھی ختم کئے دیتا ہوں۔ حضرات! آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ اخبارات کے توہین آمیز مضامین نے ہم پر کتنا اثر کیا ہے۔ ہمارا اخلاص پر یقین کیجئے اور کوشش کیجئے کہ یہ غلط دھبہ جو سخت بے انصافی سے ہمارے نام پر لگا دیا گیا ہے کسی طرح مٹ جائے۔ شکریہ۔"

وفد کا لیڈر میز سے جھک کر اپنے رفقار میں شامل ہو گیا۔ ممبر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ تب ایک وقفے کے بعد صاحب صدر اٹھے۔

"ہمیں آپ پر کامل بھروسہ ہے۔ اور ہم ہر ممکن کوشش کریں گے کہ آپ کی انجمن پر ناجائز الزام لگایا گیا ہے اس کو مٹایا جائے۔ نیز یہ کہ میرے احباب نے مجھے اس بات کا اختیار دیا ہے کہ میں ان کی طرف سے آپ کے شہریت کے گہرے احساس کی تعریف کروں اور اس احساس کو وقعت کی نگاہ سے دیکھوں۔ اور جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں وفد کے لیڈر سے اجازت چاہتا ہوں کہ ان سے مصافحہ کروں۔"

دونوں بلند قامت اور متین انسان ایک لمحہ ایک دوسرے کا ہاتھ دبائے کھڑے رہے۔

ممبر تقریباً نکل رہے تھے لیکن ان میں سے چار ابھی کپڑوں کی کھونٹیوں کے نزدیک کھڑے تھے آئزک (Issac) کا نیا سفید ہیٹ گم تھا۔ اس کی جگہ کپڑے کی ایک میلی سی پھٹی ہوئی ٹوپی لٹک رہی تھی۔

"یاشا!" مقرر کی گرجتی ہوئی آواز دروازے کے دوسری جانب سنی گئی "یاشا! یہ آخری بار ہوگی کہ میں تم سے کلام کروں گا۔ تم پر لعنت بھیجوں گا! - - - - کیا تم سنتے ہو؟"

(Issac)

بھاری دروازہ کھلا۔ وفد کا لیڈر اندر داخل ہوا۔ ہاتھ میں آئزک کا ہیٹ پکڑے تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ نمایاں تھا۔

"حضرات! خدا کے لئے ہمیں معاف کیجئے۔ یہ صرف غلط فہمی کی وجہ سے ہوا۔ ہمارے ایک رفیق سے اتفاقاً ٹوپی تبدیل ہو گئی - - - -

اوہ - یہ آپ کی ہے! معاف چاہتا ہوں ——— یاشا! تم چیزوں کا دھیان کیوں نہیں رکھتے؟ اچھا وہ ٹوپی مجھے دے دیجئے۔ حضرات! میں پھر ایک بار معافی کا خواستگار ہوں۔"

وہ ایک خاص انداز سے جھکا۔ اور جلدی سے مسکراتا ہوا باہر چلا گیا ✦

# اقتباسات

## ایک اخبار نویس کی سیاحت

اخبار "ٹریبیون" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مسٹر لی۔ چند۔ حال ہی میں چند روز کے لیے روس گئے تھے جس کے مختصر حالات ساربان کے گزشتہ پرچہ میں درج کئے گئے تھے۔ اسی سلسلہ میں آپ اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ میری سیاحت روس مختصر یعنے تین ہفتہ تک محدود تھی لیکن اس تھوڑے سے عرصہ میں جو کچھ میں نے دیکھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وقت آنے پر روس ترقی کے لحاظ سے تمام دنیا سے بڑھا ہوا ہوگا جس امر کے حاصل کرنے میں دوسرے ممالک نے ایک صدی صرف کی اسی کو روس نے دس سال میں حاصل کر لیا ہے۔ روس سے جہالت کا خاتمہ ہو چکا ہے اور تعلیم آندھی کی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں ایک زراعتی ملک اول درجہ کے صنعتی ملک میں تبدیل کر دیا گیا ہے"۔

ایک وقت تھا کہ دنیا کے ممالک روسیوں کے انقلابی ارادوں سے بیحد خوفزدہ نظر آتے تھے لیکن اب روسی اپنی حالت کو درست کرنے میں مشغول نظر آتے ہیں چنانچہ مسٹر چندر لکھتے ہیں:۔

" ممکن ہے کہ لسبن عالمگیر انقلاب کے ارادے رکھتا ہو لیکن موجودہ روسی مدبر اس قسم کا کوئی منصوبہ نہیں رکھتے۔ وہ اپنی تمام توجہ اپنے ملک کی حالت کو بہتر بنانے میں صرف کر رہے ہیں۔ اور اس میں وہ حق بجانب بھی ہیں کیونکہ اپنی حالت کو درست کئے بغیر دوسروں کی فکر کرنا حماقت تھا"

روسیوں کی اشتراکیت، تعلیم اور عورتوں کی حالت کی نسبت لکھا ہے:۔

"روس میں اشتراکیت نے مضبوطی سے قدم جما لیے ہیں۔ اور زاریت یا سرمایہ دارانہ نظام کے دوبارہ قائم ہونے کا قطعی کوئی احتمال نہیں رہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اشترا کی خیالات روس سے نکل کر دنیا کے دوسرے ممالک میں پھیلتے جائیں گے۔

روس میں رنگ اور نسل کا امتیاز بالکل نہیں پایا جاتا۔ گورے اور کالے کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہے۔ روس میں گرجے قائم ہیں لیکن وہاں صرف بوڑھے جاتے ہیں۔ نوجوان علوم سائنس حاصل کرنے کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ حتی کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی ریڈیو اور ہوائی جہاز کی تعمیر کے اصول سمجھائے جاتے ہیں۔ علم الحیات (بیالوجی) میں ایک چھوٹا سا روسی بچہ ایک اوسط قابلیت کے ہندوستانی گریجوایٹ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔

روس میں مرد اور عورت میں مکمل مساوات قائم ہے۔ عورتوں کو مردوں کے برابر تنخواہ دی جاتی ہے اور وہ ہر پیشہ اختیار کر سکتی ہیں حتی کہ ٹریم چلاتی، اور بری و بحری فوج میں بھرتی ہوتی ہیں"۔

آخر میں مسٹر چندر لکھتے ہیں کہ اگرچہ روس نے سابقہ حالت کی نسبت حیرت انگیز ترقی کر لی ہے لیکن ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ خاص طور پر بہتر مکانات عمدہ سڑکوں اور جسمانی لباس میں کافی ترقی کی ضرورت ہے۔ لیکن تمام روسی پر امید معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ ترقی کرتے کرتے وہ اپنے ملک کو زمین پر ایک بہشت کا نمونہ بنا دیں گے۔

## متحدہ قومیت

ہندوستان کی آزادی کے دشمن اور خود غرض لوگ طرح طرح سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس ملک میں متحدہ قومیت قائم نہیں ہو سکتی۔ برخلاف اس کے ہم نے "ساربان" کے صفحات پر متعدد مرتبہ دلائل کی رو سے اور بہ تفصیل لکھا ہے کہ رنگ نسل عقائد اور مذہبی اختلافات ہندوستان کی متحدہ قومیت کے منافی نہیں۔

آج سے دو سال قبل مشہور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم نے ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کر کے تقریریں کی تھیں۔ وہ ناظرین نے اخبارات میں پڑھ لی ہوں گی۔ اس وقت ہم خاتون مذکور کی تقریروں کے بعض اقتباسات درج کرتے ہیں۔

ہندوستان کی متحدہ قومیت کی نسبت آپ نے فرمایا:-

"میں یہ کہہ دینا چاہتی ہوں کہ خواہ آپ کے ملک میں کتنی ہی بڑی بڑی قابل ہستیاں اور بڑی بڑی یونیورسٹیاں ہوں لیکن جب تک آپ عامۃ الناس کی اقتصادی حالت کو بہتر بنائیں گے ہندوستان میں متحدہ قومیت قائم نہیں ہو سکتی۔"

ہندو مسلم اتحاد کی نسبت اظہار رائے کرتے آپ نے فرمایا تھا:-

"ہندو مسلم سوال تمہارا خانگی معاملہ ہے۔ آپ لوگ ہندوستان کے اندر خواہ کچھ ہی خیال کریں لیکن ہم لوگ جو ترک ہیں۔ اسلام کو فرقہ پسند جذبات پر مبنی نہیں سمجھتے۔ اصولی رنگ میں دیکھا جائے تو اسلام اتفاق تعاون اور انسانی مساوات کا نام ہے مجھے یقین ہے کہ اگر سینکڑوں ہندو بھائیوں کے درمیان ایک مسلمان ہو تو بھی ہندوستان کی بہبودی کا خیال اس کے مذہب کا ایک جزو ہونا چاہیئے۔ مسلمان خواہ ایک ہو یا دس لاکھ اس کا فرض ہے کہ وہ دوسرے ہندوستانی آزاد لوگوں کے دوش بدوش ہندوستان کی خدمت کرتا ہوا نظر آئے۔"

خالدہ ادیب خانم ایک نہایت بیدار مغز ترکی خاتون ہیں جنہوں نے اپنے ملک کو اغیار کی دست برد سے آزاد کرانے اور اس کے تحفظ میں بیش بہا عملی خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس لحاظ سے آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بحیثیت مجموعی ترکی قوم کے خیالات ہیں۔ مسلمانوں کو غور کرنا چاہیئے کہ اصل اسلام وہ ہے جس کے حامل ترک ہیں یا وہ جو ہندی مسلمانوں نے اختیار کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے اس ملک کے تمام باشندے جن میں مسلمان بھی شامل ہیں غلامی کی لعنت میں مبتلا ہیں۔

## ملیریا اقتصادی نقطہ نظر سے

ملیریا یعنے مچھر کے کاٹنے سے جو بخار ہوتا ہے ہندوستان میں اس قدر عام ہے کہ یہاں کا کوئی باشندہ اس کے حملہ سے محفوظ ہونے کا دعوی نہیں کر سکتا۔ لیکن ہندوستان کی اجتماعی زندگی پر ملیریا کا جو اثر ہوتا ہے اس کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہوگا۔ محکمہ حفظان صحت (یو۔پی) کے سابق ڈائرکٹر لفٹنٹ کرنل سی۔ ایل۔ ڈنلپ نے ہندوستان میں ملیریا کے اثرات سے متعلق ایک مضمون لکھا تھا جس کے چیدہ حصوں کا خلاصہ ہم ہدیہ قارئین "ساربان" کرتے ہیں:-

"وبار ملیریا ہندوستان کے سب سے بڑے اقتصادی مسائل میں سے ہے۔ اگر حسب ضرورت مقدار میں کونین مہیا ہو سکے تو ملیریا کی وجہ سے کام کرنے کے دنوں کا جو نقصان ہوتا ہے اس میں نوے فی صدی کی کمی واقع ہو جائے۔ اس کے علاوہ کام کرنے کی رفتار بھی بقدر پچاس فی صدی بڑھ جائے۔ موجودہ حالات میں ہر کارندہ سال میں چالیس یوم ملیریا کی وجہ سے کام نہیں کر سکتا۔ یہی نہیں بلکہ ملیریا سے کمزوری کی وجہ سے تقریباً تین ماہ تک پوری قوت سے کام سرانجام نہیں دے سکتا۔

پنجاب اور یو۔پی میں ستمبر اور اکتوبر کے مہینوں میں ملیریا کا زور ہوتا ہے اور یہی ایام ہیں جبکہ یہاں کے کسان گندم کی بیجائی کے لیئے زمین کی تیاری کرتے ہیں۔ ماہرین زراعت نے اندازہ لگایا ہے کہ مقررہ تعداد سے ایک مرتبہ زائد ہل چلایا جائے تو اناج بقدر پچیس فی صدی زیادہ حاصل ہوگا جس سے کسان اور معاملہ کی زیادتی کی شکل ہی حکومت کو بھی فائدہ ہو۔ پس وبا ملیریا کا انسداد ایک انسانی فرض ہی نہیں بلکہ حکومت کے لیئے بھی مالی منفعت کا باعث ہوسکتا ہے۔"

اس اقتباس سے انسداد وبا ملیریا کی اہمیت اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے۔ ناظرین یہ معلوم کرکے تعجب کریں گے کہ ہر سال تقریباً دس کروڑ ہندوستانی اس کا شکار ہوتے ہیں جن میں سے اسی فی صدی کو کونین یا کوئی اور طبی امداد نہیں ملتی یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں ہر سال پانچ لاکھ انسان ملیریا کی وجہ سے ہلاک ہوجاتے ہیں۔

## ہمارا نظام تعلیم

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ قومی فلاح و بہبود کا انحصار قوم کے افراد کی تعلیم پر ہے۔ بلکہ قومی تنظیم و ترقی کے پروگرام میں سب سے پہلے اسی کو بنیاد کے طور پر قائم کرنا ضروری ہے۔ لیکن ہندوستان میں نظام تعلیم کا مقصد صرف یہ رہا ہے کہ سرکاری محکموں کے لیئے ملازم مہیا کئے جائیں۔ اس کے علاوہ تعلیم دولت مند اور متوسط طبقہ تک محدود رہی۔ یہ خیال صحیح نہیں نکلا کہ اونچے طبقوں سے تعلیم خود بخود ادنیٰ طبقوں تک سرایت کرجائے گی۔ اس لیئے ضرورت ہے کہ نظام تعلیم کو نئے سرے سے اور نئی بنیادوں پر قائم کیا جائے مثلاً سب سے ضروری یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کو لازمی قرار دیدیا جائے۔

بمقام جونپور خواجہ غلام السیدین پرنسپل ٹریننگ کالج علیگڈھ نے ایک کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے موجودہ نظام تعلیم کے نقائص پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:۔

"جب تک قوم کا ہر فرد تعلیمیافتہ نہ ہو ملک کی سیاسی یا صنعتی تنظیم محال ہے۔ ہندوستانیوں کے لیئے یہ امر باعث شرم ہے کہ ہمارے ملک کے نوے فی صدی باشندے لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ حکومت کے لیئے بھی یہ امر باعث مذمت ہے کہ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں چالیس سال کے عرصہ میں تعلیم یافتوں کی تعداد میں ایک فی صدی سے بھی کم اضافہ ہوا ہے۔ اگر یہی رفتار جاری رہی تو تمام ملک کو تعلیم یافتہ بنانے میں پانچ ہزار سال درکار ہوں گے۔"

ہمارے خیال میں جہاں تعلیم کو ہر شخص کے لیئے لازمی قرار دینا ضروری ہے وہاں تعلیم کے معیار کو بھی بہت حد تک بلند کرنا چاہیئے کیونکہ اس وقت جو بچے پرائمری کا درجہ پاس کرتے ہیں وہ اچھی طرح پڑھ سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدرسہ سے نکلتے ہی تھوڑے عرصہ میں وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں حتیٰ کہ نام تک لکھنا بھی فراموش کردیتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کو اس قابل بنادیا جائے کہ مدرسہ سے نکلنے کے بعد وہ اخباروں یا دیگر کتابوں کا مطالعہ کرسکیں تاکہ ان کی تعلیمی مشق آیندہ نہ صرف قائم رہے بلکہ اس میں ترقی ہوتی رہے۔

## اخبار نویسوں کا فرض

اخبارات و رسائل سینکڑوں ہزاروں لوگوں کی نظر سے گزرتے ہیں۔ اس لحاظ سے جریدہ نگاروں پر بہت بڑی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ مگر افسوس کہ سو میں سے ایک آدھ کے سوا باقی تمام جریدہ نگار اپنے اس فرض سے غافل ہی نہیں بلکہ دیدہ و دانستہ لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حال ہی میں بمقام کلکتہ مسز سروجنی نیڈو نے جریدہ نگاروں کی ایک مجلس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اخبار نویس قوم کی تعمیر کرنے والے ہیں اور ان کا درجہ سیاستدانوں کے برابر ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ پبلک نے ابھی تک جریدہ نگاری کی صحیح قدر و قیمت کو نہیں پہچانا۔"

آگے جاکر جریدہ نگاروں کے فرائض سے متعلق آپ نے فرمایا:۔

"جریدہ نگاروں کا اہم ترین فرض مختلف اقوام اور فرقوں میں اتحاد اور رواداری کے جذبات پیدا کرنا ہے۔ ہندوستان کو اس وقت اسی چیز کی ضرورت ہے۔ اخبار نویس اس مقصد کے حصول میں بہت حد تک امداد بہم پہنچاسکتے ہیں۔"

# شذرات

## ترقی کے لیئے ذہنی ترقی کی ضرورت ہے

انسان جو کچھ کرتاہے اپنے ارادہ اور اختیار سے کرتا ہے حتیٰ کہ بغیر مقصد کو سامنے رکھے ایک قدم بھی آگے کی طرف نہیں بڑھاتا۔ مقصد کے تعین کے لیئے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے پس انسان کے نفع و نقصان اور ترقی و تنزل کا انحصار اس کی قوت فکر پر ہے۔ تھوڑا عرصہ ہوا بھائی پرمانند صدر ہندو مہا سبھا نے اخبارات میں ایک بیان شائع کرایا تھا۔ ہمیں اس مضمون کے اغراض و مقاصد سے غرض نہیں اور نہ ہی اس کے نفس مضمون کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں البتہ اپنے بیان کے دوران میں بھائی جی مذکور نے ایک بات ایسی کہی ہے جس کی طرف توجہ دلانے کی غرض سے ذیل کی سطور لکھنا پڑیں۔ آپ کانگرس کی ہندوؤں کے ساتھ مفروضہ دشمنی کا تذکرہ کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"میرے خیال میں پنڈت جی کا دماغ خالصتاً مغربی تہذیب اور مغربی تعلیمات کی پیداوار ہے۔ آپ کے ذہن میں جو خیالات جم گئے ہیں اگر ان کو عملی جامہ پہنایا گیا تو مجھے یقین ہے کہ ہماری جملہ قدیمی روایات مٹ جائیں گی۔ اور ان تمام چیزوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جن کو ہندو عزیز رکھتے ہیں"

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کو جن لوگوں یا جن چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے ان سے ایک خاص قسم کا لگاؤ اور تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان نہیں چاہتا کہ یہ تعلق منقطع ہو۔ اس قسم کا جذبہ انسان کے اندر قدرتی طور پر موجود ہوتا ہے۔ اس جذبہ کا ایک فائدہ بھی ہے کہ انسان اپنے ماحول کو یکساں حالت میں قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان ہر آن نئی چیز کی خواہش کرے اور اس طرح اپنی زندگی کو مصائب میں ڈال دے لیکن باوجود اس کے اگر انسان اپنے آپ کو کلیۃً اس جذبہ کے سپرد کر دے تو وہ کوئی ترقی نہیں کرسکتا۔ انسان کو ترقی کی طرف لے جانے کی غرض سے قدرت نے جہاں اس میں قدامت پرستی کا جذبہ پیدا کیا ہے وہاں اس کے پہلو بہ پہلو جستجو اور نئی چیزوں کی دریافت کی خواہش بھی رکھی ہے۔

اگر انسان میں یہ خواہش نہ ہو تو انسان قطعاً کوئی ترقی نہیں کرسکتا۔ ایک وقت تھا کہ انسان جنگلی جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا وہ گھر بار بناتا اور نہ جسم کو ڈھانکنے کے لیئے لباس تیار کرتا۔ اگر انسان اس وحشت اور درندگی کی حالت سے نکلنے سے انکار کر دیتا تو یہ سر بفلک عمارتیں اور تہذیب و تمدن کے دوسرے مناظر کیونکر دیکھنے میں آسکتے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ مسلمانوں کے آنے سے قبل ہندوستان کے باشندے سلے ہوئے کپڑوں کا استعمال نہ جانتے تھے اور ننگے پاؤں اور ننگے سر پھرا کرتے تھے۔ اگر ہمارے آباؤ اجداد تبدیلی اختیار نہ کرتے تو آج ہم بھی ننگے پاؤں اور ننگے سر پھرا کرتے۔ اسی طرح اس سے بھی قریب تر زمانہ میں دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ہمارے ملک میں ریلیں تھیں نہ موٹر اور ہوائی جہاز حالانکہ آج ان چیزوں کا رواج بالکل عام ہو گیا ہے۔ ہمارے باپ دادا گدھوں پر سوار ہوتے یا پرانی طرز کی بہلیوں کو استعمال کرتے۔ اب بھائی پرمانند خود ہی

چاہئیں کہ اپنے باپ دادوں کی چیزوں کو چھاتی سے لگائے رکھیں یا عقلِ انسانی نے جو نئی نئی چیزیں تیار کی ہیں ان کے استعمال سے فائدہ اُٹھائیں۔

آج سیاسی غلامی، اقتصادی بدحالی، اور معاشرتی خرابیوں کی وجہ سے ہندوستانیوں کی زندگی بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ اور اگر یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو کوئی دن آتا ہے کہ ؎

ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اب سوال یہ نہیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے دماغ پر مغربیت کا اثر ہے یا مشرقیت کا بلکہ یہ کہ کیا ہم اپنے باپ دادوں کے پرانے طریقوں کو سینہ سے لگائے رکھیں یا اپنی تکلیفوں کو جن کی وجہ سے ہماری زندگی جہنم کا نمونہ بنتی جا رہی ہے دور کرنے کی کوشش کریں۔ ضرورت تبدیلی کی ہے خواہ وہ جواہر لال کے طریقوں سے ہو یا کسی اور شخص کے بتلائے ہو نسخہ کے مطابق۔ ورنہ اگر بھائی پرمانند کی طرح تبدیلی کی ضرورت سے انکار کیا گیا تو یاد رکھو کہ ہمیں اس ملک سے اسی طرح نیست و نابود کر دیا جائے گا جیسا کہ آسٹریلیا کے اصلی باشندوں کو صفحہ ہستی سے ہماری آنکھوں کے سامنے مٹایا جا رہا ہے۔

## عالمگیر انسانی برادری

دنیا میں جدھر نظر دوڑاؤ قومیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نظر آتی ہیں۔ ہندو اور مسلمان ہی نہیں بلکہ جرمن، فرانس، انگلستان، اٹلی، چین اور جاپان تمام ممالک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے ہیں۔ اور قریب ہیں کہ بس چلے تو ایک دوسرے کو صفحہ ہستی سے فنا کر دیں۔

یہ منافقت اور چپقلش وطن پرستی کے غلط تخیل پر مبنی ہے۔ مذہب دنیا کو محبت اور آشتی سکھلانے آیا تھا لیکن جذبہ وطن پرستی مادی فوائد کی جستجو کرتا ہے اور اس کی بنیاد نفرت و حقارت پر ہے۔ حقیقی مذہب اور موجودہ رنگ کی وطن پرستی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

بہ ظاہر مختلف ملکوں کے لوگ شکل و شباہت، رنگ، عادات، زبان، لباس اور عادات میں مختلف نظر آتے ہیں لیکن دراصل تمام انسانوں کی اصلیت اور فطرت ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ملکوں بلکہ مختلف زمانوں کے لوگوں کی عادات و اطوار، اور خواہشات و رجحانات میں کوئی فرق نظر نہ آئے گا۔

پس حقیقی مذہب وہ ہے جو اس حقیقت کو نمایاں کر سکے کہ تمام انسان بھائی بھائی اور ایک ہی خاندان کی طرح ہیں۔ مذہب کا تعلق مادی فوائد سے نہیں بلکہ محبت، انصاف اور مساوات حقیقی مذہب کی اصل بنیاد ہیں۔

مذہب کے مذکورہ بالا تخیل کو ترقی دینے کے لیئے ضروری ہے کہ ہم اپنی تعلیمی کتابوں میں انسانی اخوت اور مساوات کے پہلو کو روشن کریں اور اس امر پر زور دیں کہ عالم انسانیت ایک خاندان کی مانند ہے اور کہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر انسانوں میں یہ جذبہ پیدا کر دیا جائے تو دنیا کی تمام جنگیں بند ہو جائیں، اور اقتصادی، تعلیمی، زراعتی، صنعتی غرضیکہ تمام مسائل جو اس وقت لاینحل خیال کئے جاتے ہیں خود بخود حل ہو جائیں۔

## دیہاتی اور شہری زندگی

بڑے بڑے شہروں کا وجود قدیم سے پایا جاتا ہے۔ اور تاریخ سے اس امر کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ ہر زمانہ میں دیہاتی شہری زندگی کو رشک کی نظر سے دیکھتے آئے ہیں۔ اور جب کسی کو موقع ملتا ہے وہ گاؤں کو خیرباد کہہ کر شہر میں آن آباد ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ایسی مثالیں بہت کم نظر آئیں گی کہ شہر کے لوگ گاؤں میں جا کر سکونت اختیار کریں۔

اگر ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اصل معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیئے۔ انسانی صحت کے لیئے تازہ اور صاف ہوا کی ضرورت ہے۔ شہروں میں تنگ گلیوں اور کئی کئی منزلہ مکانات کی وجہ سے صاف ہوا کا گزر مشکل ہوتا ہے اور مکانات بھی تنگ اور تاریک ہوتے ہیں۔

جب کوئی دیہاتی شہر میں آتا ہے تو نان بائیوں کی سبزی ترکاری کو بہت بڑی نعمت تصور کرتا ہے حالانکہ صاف ستھری سبزیاں، تازہ دودھ مکھن گاؤں میں ہی میسر آ سکتے ہیں۔ گائے بھینس رکھنے اور مرغیاں پالنے کے لئے بھی شہر کی نسبت دیہات زیادہ موزوں ہیں۔ اس کے علاوہ پھل دار درخت اور پھولوں کے پودے لگانے کے لئے بھی شہر میں کوئی گنجائش نہیں۔

غرضیکہ جہاں تک غور کرو تازہ ہوا، صاف ستھرے کھانوں دودھ دہی و مکھن، تازہ سبزی ترکاری اور پھلوں کے لئے شہر کی نسبت دیہات زیادہ موزوں ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہمارا انتظام معاشرت ایسا ہے کہ دیہاتی ہی سب سے منحوس اور قابل نفرت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ لوگ خون اور پسینہ ایک کرکے کھانے کے لئے اناج اور پارچات کے لئے کپاس پیدا کرتے ہیں لیکن یہی لوگ ہیں جن کو پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا ہے اور نہ تن ڈھکنے کو کپڑا۔

آج کل رہنمایانِ قوم اور حکومت دونوں کی توجہ اصلاح دیہات کی طرف منعطف ہے۔ اور دونوں کی کوشش ہے کہ اس امر میں ایک دوسرے سے بازی لے جائیں، لیکن ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ بے زبان دیہاتیوں کی اصلاح کا معاملہ باتیں بنانے یا سطحی اصلاحات سے سرانجام نہیں پا سکتا۔ ضرورت ہے کہ انصاف اور انسانیت کو مد نظر رکھ کر دیہاتیوں کی پستی اور ذلت کے بنیادی اسباب کو دور کیا جائے۔

## پنجاب کے زمینداروں کا قرضہ

تاریخی قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزی حکومت میں شامل ہونے کے وقت پنجاب کے زمیندار قرضہ لیتے دیتے تھے لیکن اس طرح کہ ادھر قرضہ لیا اور ادھر فصل کے موقع پر ادائیگی کر دی۔ ایسے قرضے کا نام و نشان نہ پایا جاتا تھا جو سالہا سال تک جاری رہے بلکہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہو۔

انگریزی سلطنت کے قائم ہوتے ہی ملک کے اقتصادی حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ زمیندار جو رقم قرضہ کے طور پر لیتے اس کی ادائیگی قریب قریب ناممکن ہو گئی۔ ذیل میں ہم پنجاب کے زمینداروں کے قرضہ کے اعداد و شمار پیش کرتے ہیں۔ جس سے زمینداروں کی حالت کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے :-

| سال | رقم قرضہ | سال | رقم قرضہ |
|---|---|---|---|
| ۱۸۴۹ء | ..... | ۱۹۱۱ء | ۹۰ کروڑ |
| ۱۸۸۰ء | ۱۷ کروڑ | ۱۹۲۱ء | ۹۰ کروڑ |
| ۱۸۹۱ء | ۳۵ کروڑ | ۱۹۳۱ء | ۱۳۵ کروڑ |
| ۱۹۰۱ء | ۵۱ کروڑ | ۱۹۳۶ء | ۲۰۰ کروڑ |

اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس قرضہ پر پنجاب کے زمینداروں کو کم از کم تیس کروڑ روپیہ ہر سال سود ادا کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اصل تو کیا اس کے سود کی ادائیگی بھی ناممکن ہے۔

یہ حال پنجاب کے زمینداروں کا ہے جن کی حالت ہندوستان کے باقی حصوں کی نسبت بہتر خیال کی جاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بحیثیت مجموعی ہندوستان کے زمیندار کس قدر خطرناک صورت حال میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

حکومت نے ۱۹۰۰ء میں قانون انتقال اراضی بنایا اور ۱۹۰۴ء میں زمینداروں کی بہبودی کے لئے امداد باہمی کے بنکوں کا اجرا کیا۔ اس کے علاوہ قرضہ ایکٹ اور ساہوکارہ ایکٹ بھی چند سال ہوئے بنائے گئے باوجود اس کے زمینداروں کی حالت بہتر تو کیا روز بروز پہلے سے بھی خراب ہو رہی ہے۔ اندریں حالات حکومت اور ملک کے بہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ دلیری اور جرأت سے اس مسئلہ کے اصل اسباب پر غور کریں اور اس کا حل نکالیں ورنہ وہ وقت دور نہیں جب کہ زمینداروں کی

ذہنیت ایک سیلاب بن کر اُٹھے گی اور تمام سوسائٹی کو زیر و زبر کر کے رکھ دے گی۔

## قوم کی ترقی افراد سے وابستہ ہے

ہندوستانیوں کی ذہنیت آج وہ نہیں ہے جو بیس سال پہلے تھی اس وقت لوگ ملک کی آزادی کا نام لینے سے ڈرتے تھے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج اگرچہ آزادی کا نام لینے سے دل میں ڈر تو پیدا نہیں ہوتا لیکن بہت ہندوستانی ایسے ہیں جو دل سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان برطانوی تسلط سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کی ذہنیت افسوسناک ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی آزادی کی راہ میں ایک خطرناک رکاوٹ ہے۔ اس قسم کے لوگ کم ہمت ہونے کی وجہ سے یہ جانتے ہی نہیں کہ عزم و استقلال سے کیسے کیسے حیرت انگیز کام سرانجام پا سکتے ہیں۔ یہ لوگ کم ہمت ہی نہیں ہوتے بلکہ تاریخ عالم سے بھی ناواقف ہوتے ہیں یہ لوگ نہیں جانتے کہ دنیا میں سب سے بڑے انسان جنہوں نے قوموں کی قسمت اور اپنے ملک کی کایا پلٹ دی تھی نہیں نہیں جنہوں نے نقش ہستی پر اپنی ذات کے نہ مٹنے والے نشانات چھوڑے ہیں۔ اگر ان کی ابتدائی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو بعد کے کارنامے جو انہوں نے سرانجام دیئے حیرت انگیز ہی نہیں بلکہ ناقابل یقین دکھائی دیتے ہیں۔

مذکورہ قسم کی حیرت انگیز ہستیاں ہر زمانہ میں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنے زمانے سے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک امر حقیقت ہے کہ اس وقت دنیا کے کثیر تعداد ممالک کے اعلےٰ ترین حاکم وہ لوگ ہیں جو غریب ترین گھرانوں میں پیدا ہوئے اور جن کی پیدائش کے وقت کسی کو سان و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ کوئی بڑا درجہ حاصل کر سکیں گے۔ مثلاً ایران کے موجودہ شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کو ہی لیجئے جو ایک غریب ترین گھر میں پیدا ہوئے اور نہایت کس مپرسی کی حالت میں بیوہ ماں نے آپ کی پرورش کی۔ لیکن بڑے ہو کر آپ نے اپنے عزم آہنی سے مملکت ایران کی کایا پلٹ دی ہے۔ اسی قسم کے لوگوں کی نسبت کسی شاعر نے کیا سچ کہا ہے ؎

اولوالعزمان دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر پھاڑتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

اس قسم کے لوگوں کی مثالیں لکھنے بیٹھیں تو کتابوں کی کتابیں پر ہو سکتی ہیں۔ ہمارا مقصد ہندوستانیوں پر اس امر کا اظہار ہے کہ وہ ہرگز ہرگز مایوس نہ ہوں۔ مایوسی گناہ ہے۔ اس سے تمام قوتیں سلب ہو کر انسان بالکل ناکارہ ہو جاتا ہے۔ ہر شخص کو اپنے دل میں یہ عزم اور پختہ ارادہ کر لینا چاہئے کہ وہ اپنے ملک کو آزاد کرا کر رہے گا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر یہ سمجھتا ہے کہ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں لیکن یہ تصور سراسر مبنی بر نادانی ہے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر یہ خیال عام ہو جائے تو دنیا کا کوئی کام بھی خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو سرانجام نہیں پا سکتا۔

یاد رکھو کہ انسانوں میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں۔ ہر شخص کے اندر عظیم الشان کام کرنے کی صلاحیت خدا نے ودیعت کر رکھی ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ ہم اپنے اوپر اعتماد رکھیں۔ اور جو مقصد سامنے ہو اس کے حصول کے لئے عزم راسخ کر لیں۔ یہ بھی یاد رکھو کہ قوم افراد سے بنتی ہے پس اگر افراد بزدل کمزور اور مایوس طبیعت رکھنے والے ہوں گے تو قوم جو ان افراد سے بنے گی وہ بھی بزدل اور نکمی ہو گی جس طرح قطرہ قطرہ پانی سے بنتا ہے اسی طرح افراد سے قوم بنتی ہے پس ضروری ہے کہ افراد اپنی اپنی جگہ پر اپنی حالت اور قوم کی حالت کو سنوارنے کا عزم راسخ کر لیں۔ اور یقین رکھیں کہ کوشش کرنے سے ہمارا ملک آزاد ہو کر ہماری حالت سنور سکتی ہے۔ ملک کی حالت کا انحصار افراد پر ہے۔ پس ہم قوم کے افراد سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اپنے دل سے مایوسی کے زہریلے جراثیم کو نکال دیں۔ آخر میں ہم اقبال کا ایک شعر درج کرتے ہیں جو مذکورہ بالا حقیقت کا حامل ہے۔ اور قارئین سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اس کو ہمیشہ دل کی آنکھوں کے سامنے رکھیں گے۔ آپ فرماتے ہیں ؎

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہ وہ قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

اپنے روپیہ کو کوئیں میں ڈال دینا

# اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ آپ پیشہ ور بھیک مانگنے والوں کو کچھ دیں

# انسداد گداگری

مُصنّفہ

## میاں سلطان احمد ودودی

**بغیر ضرورت بھیک مانگنے اور بھیک دینے کو روکنے کی بہترین کتاب ہے**

اس میں آیات قرآنی ۔ احادیث نبوی ۔ علماء کرام اور صوفیائے عظام ۔ حکماء ۔ اور مشاہیر کے اقوال اور تاریخی واقعات سے بھیک مانگنے کی برائیاں ظاہر کی گئی ہیں ۔ اور زکوٰۃ خیرات اور صدقات کا صحیح مصرف بیان کر کے بغیر ضرورت بھیک مانگنے اور دینے کو روکنے کے مفصل طریقے بیان کئے گئے ہیں ۔ معزز اہل الرائے حضرات اور اسلامی اخبارات نے اسے بہت پسند فرمایا ہے ۔ اور ہر ایک مسلمان کو اس کے مطالعہ کی سفارش کی ہے

اس مضمون پر ایسی جامع اور مفید کتاب اور کوئی نہ ملے گی !

**اس کتاب کا ہندوستان کی کئی ایک زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے**

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ۔ لکھائی ۔ چھپائی دیدہ زیب ۔ قیمت صرف ایک روپیہ مجلد مع طلائی عمر

## اپنے شہر کے تاجران کتب سے خریدیئے

یا براہ راست

## مینیجر نظامیہ بکڈپو بٹالہ (پنجاب) سے طلب فرمائیے

## قابل قدر رائیں !

"شہاب" راولپنڈی : ... مسلمانوں کے خطرناک افلاس کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔

"مسلمان" لاہور : یہ کتاب شائع کر کے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

"الفضل" قادیان : یہ نہایت مفید اور قابل قدر کتاب ہر لحاظ سے مفید اور دلچسپ ہے۔

"اہلحدیث" امرتسر : اس کتاب میں بہت ضروری مضمون پر بحث کی گئی ہے۔ کتاب کا کاغذ لکھائی چھپائی ہر طرح سے عمدہ ہے۔